نور الایمان، مرتبہ مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی مترجمہ مولوی افتخار احمد قادری تقطیع متوسط کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۴، قیمت سات روپئے ناشر اسلامی اکیڈمی، مبارکپور اعظم گڈھ، یوپی،

مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی متبحر علما و مصنفین میں تھے "نور الایمان بزیارۃ آثار الرحمن" ان کی مشہور تصنیف ہے، یہ اس کا اردو ترجمہ ہے، اس میں مدینہ طیبہ، روضۂ مبارکہ اور قبور کی زیارت کے دلائل و آداب تحریر کئے گئے ہیں، ان امور کے نفس جواز میں کوئی اختلاف نہیں البتہ ان کے لئے "شد رحال" یا ان کو فرض اور عظیم عبادت سمجھنے میں اختلاف ہے اور یہ صرف ابن تیمیہؒ ہی کا مسلک نہیں ہے بلکہ بعض دوسرے اسلاف سے بھی منقول ہے جیسا کہ خود تقریظ نگار نے بھی اعتراف کیا ہے، (ص ۹) مصنف نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے، اور اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض آثار مقدسہ جنت البقیع، مساجد اور کنوؤں کا ذکر کرکے ان کے مقدس و متبرک ہونے کو ثابت کیا ہے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استعانت کو جائز قرار دیا ہے اور اس کو شفاعت سے خلط ملط کر دیا ہے، اور اسی طرح مردوں کے تصرف کو بھی ثابت کیا ہے، یہ اور اس طرح کی بعض دوسری رائیں دوسرے لوگوں کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، تقریظ نگار اور مترجم کی تحریروں میں مناظرانہ رنگ غالب ہوگیا ہے، مترجم نے بعض مسائل میں مولانا کی رایوں سے اختلاف کیا ہے، جیسے مولانا کے نزدیک قبروں پر پردے ڈالنا مکروہ ہے اور جب میت گل کر مٹی ہو جائے تو قبر پر کھیتی کرنا، عمارت بنانا اور اس کے اوپر چلنا جائز ہے (ص ۵۱) قبر پر زینت کے لئے عمارت بنانا حرام ہے اور بعد دفن قبر کا مستحکم کرنا مکروہ ہے (ص ۵۰، وغیرہ) لیکن مترجم کو ان باتوں سے مکمل اتفاق نہیں، مولانا نے سنن ابو داؤد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قبر کے پاس جانور ذبح کرنا اسلام میں نہیں ہے، محشی کے نزدیک اگر یہ نام آوری اور اشتہار کے بجائے ایصال ثواب کے لئے ہو تو جائز ہے، اس طرح تو جس حکم کو چاہے جائز اور ناجائز ثابت کیا جاسکتا ہے، "ض"

جلد ۱۲۲ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۸ء عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

شذرات

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے متعلق ایک ایکٹ لوک سبھا میں زیر غور ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر اس کی طرف اٹھی ہوئی ہے کہ یہ منظور ہو کر ان کی امنگوں اور تمناؤں کو کہاں تک پورا کرتا ہے، اور حکومت اپنی وطنی رواداری اور سیاسی فراخ دلی کا ثبوت کس طرح دیتی ہے،

مسلم یونیورسٹی کا کردار خصوصی ہے یا تاریخی یا اقلیتی، اس پر بحث جاری ہے، جمہوریت میں الفاظ کی بڑی پر فریب دل آویزی ہوتی ہے، جن سے دلوں کو بہلانے، جذبات سے کھیلنے، قانونی فوائد اٹھانے اور ضرورت کے وقت باہمی آویزش پیدا کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، مسلم یونیورسٹی بھی جمہوریت کی تماشا گاہ بنی ہوئی ہے، یہ تلقین جاری ہے کہ یہاں فرقہ واریت نہ ہو، یہ قومی دھارے سے الگ تھلگ نہ ہو، سیکولرزم کا نمونہ ہو، مگر جب کسی اسلامی ملک کا کوئی سربراہ یا ممتاز شخص ہندوستان آتا ہے، تو اس کو اس کی زیارت کے لئے ضرور بھیجا جاتا ہے، تاکہ وہ دیکھ کر خوش ہو کہ یہاں کی سیکولر حکومت میں یہاں کی اقلیت اپنی تعلیمی، تہذیبی، اور دینی روایات کے ساتھ ایک عظیم ادارہ کو کس طرح قائم کئے ہوئے ہے، مگر سیکولرزم کے اس نشان کے ہاتھی کو دکھا کر یہ بھی اعلان ہوتا ہے کہ اس کے اقلیتی کردار کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا،

اس راج ہٹ کے نتیجہ کا کوئی کبریٰ اور صغریٰ نہیں ہے، کیرالا میں عیسائیوں کی درسگاہوں کا اقلیتی کردار تسلیم کر لیا گیا ہے، خود یو۔پی میں مسلمانوں کے بعض کالجوں کی طرح اعظم گڈھ کے شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج کو اقلیتی ادارہ مان لیا گیا ہے، اس کا سارا نظم و نسق مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، حالانکہ یہاں پڑھنے والے طلبہ کی اکثریت غیر مسلموں کی ہے، مگر مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار محض اس لئے تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ حکومت نہیں چاہتی کہ اس کا کردار اقلیتی ہو،

حکومت کو یہ شبہہ ہے کہ کہیں یہ اپنے اقلیتی کردار کی وجہ سے سیکولرزم کے خلاف ایک زبردست محاذ نہ بن جائے، اس ملک کے ہر حصہ میں یونیورسٹیاں ہیں، جو یہاں کی اکثریت کے مزاج اور مرضی کے مطابق چل رہی ہیں، ان کے ذریعہ سے اگر سیکولرزم پنپ نہیں سکتی، اور صرف ایک مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے سیکولرزم سپرد خاک ہو سکتی ہے، تو اس سے ظاہر ہے کہ سیکولرزم کے عاشقوں کی برات محض شاخ آہو پر ہے،

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا سومناتھ ہے، محمود غزنوی نے اپنے فاتحانہ اور سپاہیانہ جوش میں سومناتھ کو مسمار کیا تھا تو وہاں کے پجاری اپنی بیچارگی اور بے بسی میں اس کو مسمار ہوتے دیکھتے رہے، اگر ہندو مورخین محمود غزنوی کی اس غیر روادارانہ بلکہ بقول اُن کے اس سفاکانہ حرکت کو آج تک نہیں بھولے ہیں، تو موجودہ دور حکومت کے محمود غزنوی مسلمانوں کے سومناتھ کو برباد کر دیں اور اس کے پجاری اپنی بے چارگی اور بے بسی میں اس کی غارتگری کو دیکھتے رہ جائیں، تو کیا مسلم مورخین اس غیر روادارانہ حرکت کو بھول جائیں گے، یا اس کو اپنی تاریخ کے صفحات پر اسی طرح تازہ رکھیں گے، جس طرح غیر مسلم مورخین گجرات کے سومناتھ کی بربادی کو تازہ رکھے ہوئے ہیں،

حکومت اگر واقعی سیکولرزم کی کامیابی کی خواہاں ہے، تو مسلم یونیورسٹی کو اپنی رواداری اور فراخ دلی کی تجربہ گاہ بنائے، تاکہ یہاں اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے جذبات و احساسات کی نشو و نما اس کی مرضی کے مطابق ہوتی رہے، یہاں اقلیت کے زیادہ سے زیادہ طلبہ جمع ہو کر اچھے سائنسداں، اچھے ڈاکٹر، اچھے انجینیر، اچھے اہل قلم، اچھے ماہر تعلیم اور اچھے صاحب دماغ پیدا ہوتے رہیں، تو کیا وہ ملک کی سیکولرزم کے لئے مفید ثابت نہ ہوں گے؟، اور اگر اقلیت کے طلبہ حصول تعلیم کی آسانیوں سے محروم ہو کر بددل، غیر مطمئن، حکومت سے بدظن اور مشکوک رہے تو

کیا وہ ملک کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچے کے لئے بار نہ ہوں گے؟ اقلیت، کو اکثریت کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے، تو اکثریت کو اقلیت کو مطمئن رکھنا بھی کم ضروری نہیں،

رہا یہ شبہہ کہ اقلیتی کردار کے تسلیم کر لینے سے مسلم یونیورسٹی فرقہ واریت کا مرکز بن جائے گی جس سے سیکولرزم اور قومی دھارے کو نقصان پہنچے گا، تو یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ دلوں کی تسخیر راج ہٹ کے ذریعہ سے نہیں ہوئی، اکبر کے دینِ الٰہی اور سیاسی حکمتِ عملی میں بظاہر بڑی رواداری اور سیکولرزم تھی، مگر وہ اپنی راج ہٹ کے تمام ذرائع استعمال کرنے کے باوجود ملک کو اپنی مرضی کے مطابق نہ بنا سکا بلکہ مسلمانوں میں تو وہ غیر مقبول رہا اور اورنگ زیب پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو تو خوش کر سکا، لیکن غیر مسلموں کو اپنے سے برگشتہ رکھا، مگر شیر شاہ سوری اور کشمیر کے زین العابدین ہندوستان کے وہ مثالی حکمراں ہیں جن پر ملک کے ہر طبقہ کو اعتماد رہا، وہ کسی جبر و استبداد، دباؤ اور راج ہٹ کے بغیر یہاں کے لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری موجودہ اور آیندہ حکومت اکبر یا اورنگ زیب کی روش پر چلتی ہے یا شیر شاہ سوری اور زین العابدین کی روایت کو اختیار کرنا پسند کرتی ہے، اس کا فیصلہ خود اصحاب حکومت نہیں، بلکہ آیندہ کے مورخین ہی کریں گے،

یہ خاکسار دار المصنفین کے ایک ضروری کام سے جون کے دوسرے ہفتہ میں پھر پاکستان جا رہا ہے، مولانا عبد السلام قدوائی ادھر کچھ عرصہ سے علیل تھے، اب رو بصحت ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو ہر طرح اچھا رکھے، تاکہ دار المصنفین ان سے برابر مستفیض ہوتا رہے آمین

دار المصنفین کی نئی مطبوعات میں تذکرۃ المحدثین جلد دوم تو چھپ کر تیار ہے، غالب مدح و قدح کی روشنی میں (جلد دوم) بھی چھپ ہو رہی ہے ۔۔۔ یہ دونوں کتابیں جلد ہمارے اراکین و دوامی کی خدمت میں پہنچ جائیں گی،

مقالات

یہود اور قرآن مجید

از

ضیاء الدین اصلاحی

سلسلے کے لئے دیکھئے معارف فروری ۱۹۸۰ء

میرے گذشتہ مضامین سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ یہود پر اللہ نے گوناگوں انعامات کئے تھے، اور اُن کو دین و دنیا کی برکتوں سے مالا مال کیا تھا، اُن کے اندر انبیاء و رسل بھی مبعوث کئے تھے، اور اُن میں حکمراں اور سلاطین بھی پیدا کئے تھے، لیکن انھوں نے خدا کی نعمتوں سے متمتع ہونے اور اس کی ہدایت کی قدر کرنے کے بجائے کفر و انکار کا رویہ اختیار کیا، اس کے دین کو مذاق اور تماشا بنایا، اس کی اور اس کے پیغمبروں کی شان میں ایسی ایسی گستاخیاں کیں، جن کی کسی موحد اور خدا کو ماننے والی جماعت سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی، غرض اُن کے عقائد، عبادات، اعمال و اخلاق میں گوناگوں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، اُن کا نہ خدا پر ایمان رہ گیا تھا، نہ رسالت پر، وہ دنیا طلبی میں اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ آخرت کا تصور اور دین کی اصل روح بالکل ہی غائب ہو گئی تھی، عبادت کی پابندیوں سے اپنے کو آزاد کر لیا تھا، اخلاقی خوبیاں ایک ایک کر کے اُن سے رخصت ہو گئی تھیں، اور رذائل اور ذمائم اخلاق ان میں رچ بس گئے تھے، اللہ کی طرف سے اُن کو

بار بار متنبہ کیا گیا اور سنبھلنے کی دعوت دی گئی، مگر انھوں نے کوئی پرواہ نہ کی، یہاں تک کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام کی اعجاز پروری اور مسیحا نفسی بھی اُن کے اندر کوئی ایمانی روح نہ پھونک سکی تو سب سے آخر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ٹھیک اُن کے صحیفوں کی پیشین گوئی کے مطابق ہوئی، لیکن انھوں نے اس نعمتِ عظمیٰ کی بھی ناقدری کی، اور اس آخری موقع کو بھی ضائع کر دیا، اور بجائے سنبھلنے کے اور بگڑتے گئے، اس لئے وہ خدا کی گرفت میں آگئے، کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جب کوئی قوم اس کی بخشی ہوئی نعمت کی ناقدری کرتی، اور اس کے دیئے ہوئے موقع کو گنوا دیتی ہے، تو اپنے کئے کی سزا پاتی ہے،

ولا یظلم ربک احدا (کہف)	اور تیرا خداوند کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔

اس قانون کے مطابق یہود کو ان کو سرکشی، عناد اور نافرمانی کی سخت سزائیں دی گئیں، اور وہ تباہیوں اور ہلاکتوں سے دوچار ہوئے، جو دوسروں کے لئے عبرت کا باعث ہیں، ذیل میں ان کی کچھ تفصیل ملاحظہ ہو۔

ہدایتِ الٰہی سے محرومی یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہود پر اللہ نے سب سے بڑا فضل و انعام یہ کیا تھا کہ ان کو اپنی ہدایت و شریعت کی نعمت سے نوازا تھا لیکن جب انھوں نے اس کی ناقدری کی تو خدا نے بھی اُن کو اپنی ہدایت سے محروم کر دیا، ارشاد ہے،

کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا کَفَرُوْا	اللہ کیسے ان لوگوں کو ہدایت دے گا
بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ وَشَھِدُوْا اَنَّ	جنھوں نے ایمان لانے اور رسول کے
الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ	برحق ہونے کی شہادت دے چکنے اور
وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ	اپنے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آجانے
(آل عمران : ۸۶)	کے بعد بھی کفر اختیار کیا، اور اللہ تو

ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا'

انھوں نے اپنی بدبختی سے ایمان و ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دی، اور رسول اکرم کی صداقت آشکارا ہو جانے اور آپؐ کی بعثت کے متعلق شریعت موسوی کے مجدد حضرت مسیحؑ کی بشارت سننے کے باوجود محض ضد تعصب اور حسد کی بنا پر آپؐ کا انکار کر دیا اور آپ کے خلاف الزام تراشیاں کرتے، اور اللہ پر جھوٹی تہمتیں عائد کرتے رہے، اس لئے وہ اس کے مستحق تھے، کہ خدا کی ہدایت ان سے چھین لی جائے، چنانچہ فرمایا:۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی	اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا
عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَھُوَ یُدْعٰی	جس نے اللہ پر جھوٹ گڑھا درانحالیکہ
اِلَی الْاِسْلَامِ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی	اس کو اسلام کی طرف بلایا جا رہا
الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ	تھا، اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت
(صف : ۷)	نہیں دیتا،

وہ کتاب و شریعت کے حامل اور ہدایتِ الٰہی کے امین بنائے گئے تھے، مگر انھوں نے اس میں خیانتیں کیں، کیا ایسے خائن، بدبخت اور ظالم لوگ خدا کی نعمت و ہدایت سے نوازے جانے کے لائق تھے،

بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ	کیا بری مثال ہے ان لوگوں کی،
کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ	جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا
لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ	اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت
(جمعہ : ۵)	نہیں دیتا،

قرآن مجید نے اُن کی ہدایتِ الٰہی سے محرومی کا ذکر دوسرے پیرایوں میں بھی کیا ہے،

ازاغت قلوب: یعنی دلوں کا کج کر دینا، اللہ نے یہ سزا اُن کی کج روی کی بنا پر دی، اور انھیں راست روی سے محروم کر دیا،

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ۔ (صف ۵)

پس جب وہ کج ہو گئے، تو اللہ نے بھی اُن کے دلوں کو کج کر دیا، اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا،

طبع قلوب: اُن کی بد اعمالی اور کج روی کی بنا پر ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، قرآن مجید نے صراحت سے کہا:-

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا۔ (نساء - ۱۵۵)

سو بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے عہد کو توڑا، اور اللہ کی آیتوں کا انکار کیا، اور نبیوں کو قتل کیا، اور یہ کہا کہ ہمارے دل بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے،

قساوتِ قلب: پتھروں کی سختی مشہور ہے۔ مگر پھر بھی بعض پتھروں سے چشمے پھوٹتے اور نہریں بہتی ہیں، اور پہاڑ بھی خدا کی ہیبت سے چور چور ہو جاتا ہے، خود بنی اسرائیل نے صحرائے سینا میں ایک چٹان سے بارہ[۱۲] چشمے پھوٹتے دیکھا تھا، اور جلوۂ ربانی سے کوہ طور کا پاش پاش ہونا اُن کے مشاہدہ میں آ چکا تھا، لیکن اُس کے باوجود اُن کے دل پتھروں اور چٹانوں سے بھی زیادہ سخت

ہو گئے تھے، اور اُن میں نیکی اور تقویٰ کی روئیدگی اور حق و ہدایت کو قبول کرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی تھی،

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ، (بقرہ - ۲، ۷)

پھر اس کے بعد بھی تمھارے دل سخت رہے، چنانچہ وہ پتھر کی طرح ہیں، بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر، اور بعض پتھر تو ایسے بھی ہیں، کہ ان سے نہریں بہتی ہیں، اور بعض پھٹ جاتے ہیں، اور ان سے پانی نکلتا ہے، اور بعض ایسے ہیں کہ اللہ کی ہیبت سے نیچے گر جاتے ہیں اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے،

خود یہود کے مذہبی صحیفوں سے بھی اُن کی قساوت قلب کا پتہ چلتا ہے:-

"وہ تربیت پذیر نہ ہوئے، انھوں نے اپنے چہرہ کو چٹان سے سخت تر بنایا، انھوں نے پھرنے سے انکار کیا[۱]..... "سارے اہلِ اسرائیل بے حیائی کی پیشانی رکھتے اور سنگدل ہیں[۲]..... اس نے ان کی سنگ دلی کے سبب غمگین ہو کر اور چاروں طرف ان پر غصہ سے نظر کر کے اس آدمی سے کہا[۳]..... تو اپنی سختی اور نا تائب دل کے مطابق اس قہر کے دن کے لئے اپنے واسطے غضب کر رہا ہے[۴]"

یہود کی اس قساوت قلبی سے مسلمانوں کو بچنے کی یوں تلقین کی گئی ہے،

---

[۱] یرمیاہ ۵-۳، [۲] حزقیل ۳-۷، [۳] مرقس ۳-۵، [۴] رومیون ۲-۵،

الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبهم لذکر الله وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیهم الامد فقست قلوبهم وکثیر منهم فاسقون، (حدید: ۱۶)

کیا ایمان والوں کے لئے قریب نہیں ہوا کہ ان کے دل جھک جائیں، اللہ کی یاد اور اس حق کے لئے جس کو اللہ نے اتارا ہے، اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، سو ان پر مدت لمبی ہوئی تو اُن کے دل سخت ہو گئے، اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں،

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہود کا ہدایتِ الٰہی سے محروم کیا جانا ان کے لئے بدترین سزا تھی،

غضب الٰہی

یہود کو متنبہ کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ کجروی سے باز نہ آئیں گے تو اُن پر خدا کا غضب نازل ہوگا، اور سخت ہلاکت و تباہی سے دوچار ہوں گے،

یا بنی اسرائیل قد انجیناکم من عدوکم وواعدناکم جانب الطور الایمن ونزلنا علیکم المن والسلوی کلوا من طیبات ما رزقناکم ولا تطغوا فیه فیحل علیکم غضبی ومن یحلل علیه غضبی فقد هوی، (طٰہٰ: ۸۱)

اے بنی اسرائیل ہم نے تمہارے دشمن سے تم کو نجات دی، اور تم سے طور کے داہنی جانب کا وعدہ کیا، اور تم پر من وسلوٰی اتارا، کہ ان پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہے کھاؤ، اور سرکشی نہ کرو کہ تم پر میرا غضب نازل ہو جائے، اور جس پر میرا غضب نازل ہو سو وہ ہلاک ہوا،

لیکن یہ تنبیہ کارگر نہ ہوئی، اور وہ دنیا پرستی میں اس طرح محو ہوئے، کہ سعادت و کامرانی کی جگہ ذلت و خواری اور خدا کی رحمت کے بجائے اس کے غضب کا اپنے کو مستحق بنا لیا، اللہ کی طرف سے سرخ روئی اور کامرانی کے جو مواقع اُن کو عطا کئے گئے، وہ ان کو ضائع کرتے رہے، اُن کی ہدایت و اصلاح کے لئے پیغمبر بھیجے گئے، اور سب سے آخر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، مگر انھوں نے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا، اور وہ امامت و شہادت کے اس منصب جلیل سے معزول کر دئے گئے جس پر ان کو مامور کیا گیا تھا،

ضربت علیهم الذلة اینما ثقفوا الا بحبل من الله وحبل من الناس وباؤا بغضب من الله وضربت علیهم المسکنة ذلك بانهم کانوا یکفرون بآیات الله ویقتلون الانبیاء بغیر حق ذلك بما عصوا وکانوا یعتدون، (آل عمران: ۱۱۲)

ان پر ذلت چپکا دی گئی خواہ کہیں بھی پائے جائیں، سوائے اس کے کہ اللہ کا کوئی عہد ہو یا لوگوں کا کوئی عہد ہو، اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے، اور ان پر پستی چپکا دی گئی، یہ اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے، اور پیغمبروں کو بلا وجہ قتل کرتے تھے، یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی، اور حد سے بڑھ جاتے تھے،

یہود کی اسی ذہنیت کی بنا پر خدا نے مسلمانوں کو ان سے ترک موالات کی تعلیم دی ہے

یا ایها الذین آمنوا لا تتولوا

اے ایمان والو، ان لوگوں کو

قوماً غضب الله علیھم،	دوست نہ بناؤ جن پر اللہ تعالیٰ
(ممتحنہ : ۱۳)	کا غضب نازل ہوا ہے۔

اور ان منافقین کا نہایت تحقیر سے ذکر کیا گیا ہے، جو یہود سے دوستی کی پینگیں بڑھائے ہوئے تھے،

الم تر الی الذین تولوا قوماً	کیا ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے
غضب الله علیھم،	ایسے لوگوں کو دوست بنایا جن پر
(مجادلہ : ۱۴)	خدا کا غضب ہوا ہے۔

مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ	خداوندا! ہم کو سیدھا راستہ چلا
صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ	ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے
غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَ	انعام کیا ہے، نہ ان کا جن پر غضب
لَا الضَّالِّينَ، (فاتحہ)	ہوا ہے،

خود توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی ناشکری اور انبیاء کو جھٹلانے اور قتل کرنے کی بنا پر بار بار خدا کے غضب اور اس کی ملامت کا نشانہ بنے،

"انھوں نے ایسی شرارتیں کیں کہ جن سے خداوند کو غصہ دلایا، کیونکہ انھوں نے بت پوجے، باوجودیکہ خدا نے انھیں کہا تھا کہ تم یہ کام نہ کیجیو، ...... اور اپنے تئیں بیچ ڈالا، کہ خداوند کے حضور بدکاریاں کریں، کہ اسے غصہ دلا دیں اس باعث سے خداوند بنی اسرائیل پر نہایت غصہ ہوا"[1]

[1] سلاطین : ۱۷ - ۱۶ - ۱۸،

زبور میں ہے:-

"خداوند نے سنا اور نہایت غصہ ہوا، اس لئے یعقوب میں ایک آگ بھڑکائی اور اسرائیل پر قہر بھی اٹھا، کیونکہ انھوں نے خدا پر اعتماد نہ کیا، اور اس کی قیامت پر اعتماد نہ رکھا"[1]

بنی اسرائیل کی تاریخ بھی گواہ ہے کہ ان پر برابر خدا کا قہر و غضب نازل ہوتا رہا، کبھی ان میں باہم شدید خانہ جنگی اور سخت خون ریزی ہوئی، کبھی دوسری قوموں نے ان کو یرغمال بنایا، ہٹلر اور نازیوں کی یہود دشمنی تو ابھی کل کی بات ہے، آگے مزید تفصیل آئے گی،

ذلت و نکبت

یہود کی مسلسل ناشکری، آیات الٰہی کی تکذیب اور دوسری نافرمانیوں کی بنا پر ذلت و خواری اور کم حوصلگی، و پست ہمتی ان پر مسلط کر دی گئی، جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

"گو یہود کا تمول ضرب المثل کی حد تک شہرت پا چکا ہے، لیکن اہل تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس جس ملک میں آباد ہیں، وہاں کی آبادی میں انہی کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے" (ج ۱۰، ص ۱۵)

قرآن نے ایک جگہ مسلمانوں کو یہود کی اسلام دشمنی کی وجہ سے ہراساں اور پست ہمت ہونے سے روکا ہے، اور بتایا ہے کہ یہ اپنی تمام تر مخالفتوں کے باوجود تمھارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے، اسی ضمن میں ان کی ذلت و نکبت کا یوں ذکر کیا گیا ہے،

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَمَا	ان پر ذلت چپکا دی گئی، خواہ وہ
ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ	کہیں بھی پائے جائیں، بجز اس کے
مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ	کہ اللہ کی طرف سے کوئی سہارا ہو

[1] باب ۸، آیت ۲۱ تا ۲۳،

وضربت علیھم المسکنة ذالک بانھم کانوا یکفرون بآیات اللہ و یقتلون الانبیاء بغیر حق ذلک بما عصوا و کانوا یعتدون،

(آل عمران ۱۱۲)

یا لوگوں کی طرف سے، اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے، اور ان پر چپکا دی گئی پستی، یہ اس سبب سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے، اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس سبب سے ہوا کہ وہ حد سے بڑھ جاتے تھے،

"اینما ثقفوا" کے الفاظ سے یہود کی ذلت و پستی کی ہمہ گیری ظاہر ہوتی ہے، اب اُن کے لئے عزت و سربلندی کی صرف یہی راہ ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل کو بدلیں اور خدا کا دامن تھام لیں، یا کسی انسانی گروہ کے زیرِ حمایت آجائیں، لیکن یہ سہارے بس عارضی اور وقتی ہیں، موجودہ اسرائیلی حکومت بھی امریکہ وغیرہ طاقتور حکومتوں کی بدولت قائم ہوئی ہے، دوسری جگہ ان کی ابدی ذلت و خسران اور دائمی رسوائی کا اس طرح ذکر ہوا ہے،

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْھِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ مَنْ یَّسُوْمُھُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّکَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(اعراف :- ۱۶۷)

اور یاد کرو جب تیرے خداوند نے فیصلہ کیا کہ وہ روزِ قیامت تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت عذاب چکھاتے رہیں گے، بے شک تیرا خداوند جلد پاداش دینے والا اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے،

یہ تنبیہ اور آگاہی بنی اسرائیل کو آٹھویں صدی قبل مسیح سے مسلسل کی جارہی تھی، خود ان کے صحف و اسفار میں ہے:-

"اور اگر تم میری سننے والے نہ ہو، اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو،...... اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا،...... اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہوگا، اور تم دشمنوں کے سامنے قتل کئے جاؤ گے اور جو تم سے کینہ رکھتے ہیں، تم پر حکومت کریں گے" (احبار ۲۶: ۱۴-۱۷)

"تیرے بیٹے اور عزیز بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی، اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی، اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہوگا"

(استثنا ۲۸: ۳۲)

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی ہر دور میں عملاً تصدیق ہوتی رہی ہے، اس کے ثبوت کے لئے یہود کی تاریخ کے بعض واقعات آگے نقل کئے جائیں گے،

رہی یہ بات کہ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ، امریکہ اور روس نے عربوں کے علی الرغم اقوام متحدہ میں تجویز منظور کرا کے اسرائیلی حکومت قائم کرادی اور پھر ۱۹۶۷ء میں ان ہی کی امداد سے اس کو کچھ مزید کامیابی حاصل ہوئی، اور عربوں کے مزید علاقے اس کے قبضہ میں آگئے تو اس سے کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اب بھی اسرائیلی حکومت کی بقا امریکہ کی سرپرستی کی بدولت ہے، دیکھئے یہ سہارا کب تک باقی رہتا ہے؟ جیسا کہ ابھی اوپر گذرا ہے، کہ یہود کو لوگوں کے سہارے اور انسانی گروہ کے زیرِ حمایت کچھ موقع مل سکتا ہے، (الا بحبل من الناس)

لعنت اور پھٹکار

لعنت ذلت سے دھتکارنے یا رحمت الٰہی سے دور کرنے کا نام ہے، رحمت الٰہی سے دوری کے بعد آدمی کی حیثیت اس درخت کی طرح ہو جاتی ہے، جس کی جڑیں کٹ گئی ہوں،

اب اسے کتنا ہی پانی دیا جائے مگر سرسبزی و شادابی ممکن نہیں ہے، کسی قوم پر اللہ کی لعنت اس عذاب سے بھی زیادہ سخت ہے، جو اسے فنا کر دے۔ لعنت کے بعد وہ قوم زندہ تو رہتی ہے مگر اس کی زندگی صرف ذلت و خواری کی ایک داستان عبرت ہوتی ہے۔

قرآن نے جابجا یہود کی اس حالت کا ذکر کیا، اور اسی کے ساتھ ان اسباب کا ذکر بھی کیا ہے جن کی وجہ سے وہ لعنت کے مستحق ہوئے تھے، ملاحظہ ہو:

وقالوا قلوبنا غلف بل لعنھم اللہ بکفرھم فقلیلاً ما یؤمنون
(بقرہ ۸۸)

اور یہود کہتے ہیں کہ ہمارے دل بند ہیں (نہیں)، بلکہ اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے لعنت کر رکھی ہے، سو وہ بہت تھوڑا ایمان رکھتے ہیں،

وہ نہایت فخر سے کہتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواہ کچھ کہیں اور کریں ہم پر اثر نہیں ہو سکتا ہے، ہمارے دل غلاف کے اندر ہیں اس لئے گرد و غبار اور خس و خاشاک سے محفوظ ہیں، قرآن نے کہا کہ ضد اور ہٹ دھرمی سے حق کو قبول نہ کرنا کوئی قابل قدر بات نہیں ہے۔

ولما جاءھم کتاب من عند اللہ مصدق لما معھم وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ فلعنة اللہ علی الکافرین
(بقرہ ۸۹)

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آگئی جو مطابق ہے اس چیز کے جو ان کے پاس ہے، (پہلے سے) موجود ہے، اور اس کے پہلے وہ خود کافروں پر فتح چاہتے تھے، لیکن جب ان کے پاس وہ آگئی جسکو خوب جانتے تھے تو اس کے منکر ہو بیٹھے، سو اللہ کی لعنت ہو کافروں پر

ایک جگہ ان کے بینات و ہدی کو چھپانے کا انجام یہ بتایا گیا ہے،

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدی من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولائک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون
(بقرہ ۱۵۹)

بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت میں سے نازل کر چکے ہیں بعد اس کے کہ ہم اسے لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر چکے ہیں کتاب میں، یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے، اور ان پر لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں

"لاعنون" کی وضاحت دوسری جگہ اس طرح کی گئی ہے۔

اولائک جزاؤھم ان علیھم لعنة اللہ والملائکة والناس اجمعین
(آل عمران ۸۷)

یہی وہ لوگ ہیں جن کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہوتی ہے،

گویا وہ صرف اللہ کی لعنت ہی کے نہیں بلکہ ملائکہ اور ساری خلقت کی لعنت کے سزاوار ہیں، اس لئے کہ اللہ نے ان کو امامت و شہادت کے منصب پر مامور کیا تھا، اور ان کو کتاب و ہدایت کی نعمت بخشی تھی، اور ان سے عہد لیا تھا کہ وہ اس امانت کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کریں گے اور اس کو ان سے پوشیدہ نہ رکھیں گے، مگر انھوں نے اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کی اس لئے لوگ بھی ان کے لئے بد دعا کریں گے، اور خدا کی مخلوق کی بھی ان پر دھتکار پڑے گی۔

یہود کی دین حق سے بیزاری اور مسلمانوں سے بغض و نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ توحید کے بجائے شرک میں ملوث ہو گئے تھے، اور مشرکین کو مسلمانوں سے بہتر اور ہدایت یافتہ سمجھنے لگے تھے، کیا اس کے بعد وہ خدا کی رحمت سے دور کئے جانے اور لعنت و ملامت کے سزاوار نہ تھے۔ فرمایا:۔

اولائک الذین لعنهم الله	یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی
ومن یلعن الله فلن تجد له	ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم
نصیرا (نساء - ۵۲)	ان کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔

تورات بھی ان کی ملعونیت کے ذکر سے بھری ہوئی ہے ملاحظہ ہو:۔

"لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوا نہ ہو گا کہ اس کے سارے شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن تجھے بتاتا ہوں دھیان رکھ کر عمل نہ کرے، تو ایسا ہو گا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر آئیں گی، اور تجھ تک پہنچیں گی تو شہر میں لعنتی ہو گا، اور تو کھیت میں لعنتی ہو گا، تیرا ٹوکرا اور کٹھرا لعنتی ہو گا، تیرے بدن کا پھل اور تیری زمین کا پھل، تیری گائے، بیل کی بڑھتی، اور تیرے بھیڑ بکری کے گلے لعنتی ہو جائیں گے تو اندر آنے کے وقت لعنتی ہو گا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہو گا خداوند ان سارے کاموں میں جن میں تو کرنے کے لئے ہاتھ لگا دے، تجھ پر لعنت اور حیرت اور ملامت نازل کرے گا، یہاں تک کہ تو ہلاک ہو گا، اور جلد نابود ہو جائے گا، تیرے عملوں کی برائی کے باعث جن کے سبب تو نے مجھے ترک کیا، خداوند ایسا کرے گا کہ وبا تجھ سے لپٹی رہے گی۔" (استثنا، باب ۲۸ - ۱۵-۲۰)

"دیکھو میں آج کے دن تمہارے آگے برکت اور لعنت رکھ دیتا ہوں، برکت جب کہ

تم خداوند اپنے خدا کے حکموں کو جو آج میں تمہیں فرماتا ہوں، مانو اور لعنت جب کہ خداوند اپنے خدا کی فرمانبرداری نہ کرو، اور اس راہ سے جس کی بابت آج میں تمہیں فرماتا ہوں پھر کے غیر معبودوں کی پیروی کرو، جنہیں تم نے نہیں جانا۔" (استثنا، باب ۱۱: ۲۶-۲۸)

قرآن مجید نے یہود پر حضرت داؤدؑ اور حضرت مسیحؑ کی لعنت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، ارشاد ہے:۔

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا مِن بنی	بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا
اسرائیل علی لسان داؤد	ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان
وعیسی بن مریم ذلک بما	سے لعنت ہوئی، یہ اس وجہ سے کہ انہوں
عصوا و کانوا یعتدون،	نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ
(مائدہ: ۷۸)	جایا کرتے تھے،

لیکن اس کا مقصد صرف ان دو نبیوں کی لعنت کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ حضرت داؤدؑ سے لے کر حضرت مسیحؑ تک ہر ہر نبی نے ان پر لعنت کی ہے، کیونکہ خود تورات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انبیا نے ان پر لعنتیں بھیجی ہیں، قرآن نے ابتداء و انتہا کے دو نبیوں کا نام محض اختصار کی وجہ سے لیا ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کی اصل سیاسی عظمت کی ابتداء حضرت داؤد ہی کے زمانہ سے ہوئی تھی، اور حضرت مسیحؑ اسرائیلی سلسلۂ نبوت کے آخری پیغمبر ہیں، اس لئے اول و آخر کے دو نبیوں کا نام لینے سے گویا تمام نبیوں کا ذکر ہو گیا ہے، یہاں اختصار کی بنا پر ان ہی دونوں پیغمبروں کی لعنتوں کو نقل کیا جاتا ہے،

"پر شریر کو خدا کہتا ہے تجھے میرے حکموں کے بیان کرنے سے کیا کام؟ کیوں اپنے منہ سے میرے عہد کا ذکر کرتا ہے، حالانکہ تو تربیت سے عداوت رکھتا ہے، اور

میرے کلام کو اپنے پیچھے پھینکتا ہے، جب تو چور کو دیکھتا ہے، تو اس سے راضی ہوتا ہے، اور زانیوں کا شریک ہوتا ہے، تو اپنا منہ شرارت پر چلاتا ہے، اور زبان سے دغا کا منصوبہ باندھتا ہے، تو بیٹھ کے اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے اور اپنی ہی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے، تو نے یہ کام کئے، اور میں خاموش رہا، تو نے گمان کیا کہ میں تجھ ہی جیسا ہوں، پر میں تجھے ملامت کروں گا، اور تیرے کاموں کو تیری آنکھوں کے آگے ایک ایک کر کے دکھاؤں گا، اب اے خدا کے فراموش کرنے والو، اس کو سوچو، ایسا نہ ہو کہ میں تمھیں پارہ پارہ کروں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو۔" (زبور ۵۰:- ۱۶-۲۲) —

حضرت مسیحؑ کی لعنت و ملامت ملاحظہ ہو، :-

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس، تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھے ہو، اور دکھاوے کے لئے نماز کو طول دیتے ہو، کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو، اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے، تو اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔...... اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ پودینہ اور سونف، اور زیرے پر تو دہ کی دیتے ہو، پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے، لازم تھا کہ یہ بھی کرتے، اور وہ بھی نہ چھوڑتے، اے اندھے راہ بتانے والو، مچھر کو چھانتے ہو، اور اونٹ کو نگل جاتے ہو، اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں، اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کرو تاکہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھیری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں، مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں، اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو، مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو، اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ نبیوں کی قبریں بناتے ہو، اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو، اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں شریک نہ ہوتے، اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو.... اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے، اس لئے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے تم بعض کو قتل کرو گے، صلیب پر چڑھاؤ گے، اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے، اور شہر بشہر ستاتے پھرو گے، تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا، تم پر آئے، راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا، میں سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانہ کے لوگوں پر آئے گا، اے یروشلم اے یروشلم تو جو نبیوں کو قتل کرتی، اور جو تیرے پاس بھیجے گئے، ان کو سنگسار کرتی ہے کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے، اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا دیکھو تمھارا گھر تمھارے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔" (متی ۲۳: ۱۴-۳۹)

(باقی) ...

ابن عبد ربّہ

(۲)

از جناب جمیلہ شوکت صاحبہ لاہور، پاکستان

ہجو اس کی ہجو بڑی سخت لیکن ملیح ہوتی ہے، وہ دوسرے شعراء کی طرح سوقیانہ ہجو نہیں کرتا، بلکہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اپنے مدمقابل پر طنز کرتا ہے، ایک دفعہ ابن عبد ربّہ نے بادشاہ کے کسی درباری سے ایک قیدی رہا کروانے کے بارے میں سفارش کی لیکن اس نے انکار کر دیا اس پر اس نے فوراً طنزیہ اشعار لکھ دئے۔[۱]

مرثیہ نگاری ابن عبد ربہ نے مرثیے صرف رشتہ داروں کے کہے ہیں، اس کے مرثیے گہرے غم و یاس کی غمازی کرتے ہیں اور نہایت موثر اور درد انگیز ہوتے ہیں:

بلیت عظامات والاسیٰ یتجدّد	والصّبر ینفد والبکاء لاینفد
یا غائباً لا یرتجیٰ لایابہ	ولقاءہ دون القیامۃ موعد[۲]

ترجمہ: تیری ہڈیاں بوسیدہ ہو گئیں لیکن میرا غم برابر نیا ہو رہا ہے، صبر ختم ہو گیا لیکن رونا ختم نہیں ہوتا، اے غائب ہونے والے جس کی واپسی اور ملاقات کی اب قیامت کے دن کے علاوہ کبھی امید نہیں۔

غزل ابن عبد ربہ نے غزل میں کثرت سے طبع آزمائی کی ہے، اس کے غزلیہ اشعار بڑے عمدہ اور لطیف ہیں اور اس کا انداز بیان بڑا پُرزور اور احساسات بڑے قوی ہیں غزل میں اس کے یہ اشعار بہترین سمجھے جاتے ہیں:

صحا القلب الا خطرۃ تبعث الاسیٰ	لہا زفرۃ موصولۃ بحنین
بلیٰ ربّما حلّت عریٰ عزماتہ	سوالف آرام واعین عین[۳]

---

[۱] العقد ۱: ۲۸۴ [۲] العقد ۳: ۱۸۲، یتیمۃ الدہر ۲: ۶۰ [۳] العقد ۶: ۲۱۰

ترجمہ: ۱. دل ہوش میں آ گیا، لیکن ابھی ایک احساس ہے جو غم کو ابھارتا ہے اور ایک پیہم آہ ہے جس کے ساتھ ایک شدید خواہش ہے۔

۲. ہاں نہیں بلکہ بسا اوقات اس کے مضبوط ارادوں کی گرہوں کو سفید ہرنیوں کی گردنوں کے پہلوؤں اور بڑی آنکھوں والی گایوں نے ڈھیلا کر دیا ہے۔

ایک دفعہ ابن عبد ربّہ کو اپنے محبوب کے کوچ کرنے کا علم ہوتا ہے تو بہت غمگین ہوتا ہے، اتفاقاً بارش ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اسے سفر ملتوی کرنا پڑتا ہے، اس موقع پر وہ یہ اشعار کہتا ہے:

ہلّا ابتکرت لبین انت مبتکر	ھیہات یابیٰ علیک اللہ والقدر
مازلت ابکی حذار البین ملتہفاً	حتیٰ رثالی فیک الرّیح والمطر[۱]

ترجمہ: ۱. صبح سویرے ہی کیوں نہ بیدار ہو گیا، اس جدائی کے لئے جو تجھے صبح ہی کرنی تھی، افسوس کہ اللہ اور تقدیر تجھے اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔

۲. میں جدائی کے خوف سے برابر روتا رہا۔ یہاں تک کہ میرے معاملہ میں ہوا اور بارش کو بھی مجھ پر ترس آ گیا۔

وصف نگاری ابن عبد ربہ کو وصف نگاری میں ید طولیٰ حاصل تھا، وہ قدرتی مناظر، جنگ و جدال، سامان حرب، گھوڑوں وغیرہ کی نہایت عمدہ تصویر کشی کرتا ہے اور پھر اس کے خوبصورت استعارے شعر کو اور زیادہ لطیف بنا دیتے ہیں۔ باغ کی تعریف میں اس نے جو اشعار کہے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

وماروضۃ بالحزن حاک لہا الندیٰ	برودًا من الموشی حمرالشقائق
یقیم الدجی اعناقہا ویمیلہا	شعاع الضحی المستن فی کل شارق[۲]

ترجمہ: ۱. اس سخت زمین میں، کتنا خوبصورت باغ ہے جس کے لئے شبنم کے پھول دار کپڑے کو سرخ

---

[۱] المقری ۲: ۲۶۶، البغیۃ ۱۳۸، مطمح ۵۱ [۲] العقد ۶: ۲۳۲

سوسن کے پھولوں سے بنا ہے۔

۲۔ تاریکی ان کی گردنوں کو سیدھا کر دیتی ہے، لیکن دوپہر کی تیز شعاعیں انھیں ہر صبح جھکا دیتی ہیں

زہد ابن عبد ربہ کو زمانۂ شباب میں غزل گوئی میں کمال حاصل تھا، لیکن زندگی کے آخری ایام میں اس نے زہد و تقویٰ کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا، اس طرح اس نے اپنے ان اشعار سے اس زاہدانہ زندگی کے داغ کو دھونا چاہا جو اس نے زمانۂ شباب میں گزاری تھی، جوانی میں یہ کہا تھا:

هلا ابتكرت لبين انت مبتكر الخ

بڑھاپے میں اسی وزن اور قافیے میں یہ اشعار کہے:

يا قادرا ليس يعفو حين يقتدر ماذا الذي بعد شيب الرأس تنتظر

انت المقول له ما قلت مبتدئا هلا ابتكرت لبين انت مبتكر[1]

۱۔ اے وہ قدرت رکھنے والے کہ جو معاف نہیں کرتا جب تجھے قدرت حاصل ہوتی ہے،

میرے سر کے بال سفید ہو جانے کے بعد تو کس چیز کا منتظر ہے۔

۲۔ تو ہی وہ ہے جس کے بارے میں میں نے شروع میں کہا تھا: هلا ابتكرت الخ

تشبیہات ابن عبد ربہ کی تشبیہات نہایت اچھوتی اور عمدہ ہوتی ہیں، اس نے تشبیہات میں متقدمین کی اتباع کے ساتھ جدت بھی پیدا کی ہے، اس کے اس شعر میں بڑی خوبصورت تشبیہ ہے:

بيضاء يحمر خداها اذا خجلت كما جرى ذهب في صفحتي ورق[2]

وہ سفید رنگ کی عورت جب شرماتی ہے تو اس کے رخسار ظاہر ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ چاندی کی طشت کے دونوں اطراف میں سونا بہہ رہا ہے۔

بیانیہ شاعری ابن عبد ربہ کو بیانیہ شاعری میں بھی ملکہ حاصل تھا، گو اس سے پہلے عبداللہ بن معتز

[1] مطمح، ۵۳۰ . یاقوت، ۲: ۶۲ [2] العقد، ۲: ۱۰۹

(م ۲۹۶ھ)[1] نے بھی اس طرز پر اشعار کہے تھے لیکن وہ زیادہ طویل نہ تھے، ابن عبد ربہ نے عبد الرحمان الناصر کے عہد کی تاریخ ایک ارجوزہ میں قلمبند کی، لیکن اس کی یہ شاعری موضوع کی خشکی، خیال کی کمزوری اور رزمیہ شاعری کے اصولوں سے دوری کی بنا پر بیانیہ شاعری سے زیادہ معلمانہ و ناصحانہ شاعری کی حیثیت رکھتی ہے۔[2] اس کا یہ طویل ارجوزہ العقد میں پھیلا ہوا ہے،[3]

موشحات ابن عبد ربہ نے موشحہ کے طرز پر لوک گیت بھی لکھے، بقول علامہ ابن خلدون اس فن کا موجد مقدم بن معافر الفریری تھا، جو امیر عبداللہ بن محمد المروانی کے دور کا نامور شاعر تھا، ابن عبد ربہ نے اس سے یہ فن سیکھا، لیکن افسوس دونوں میں سے کسی کا موشح ہم تک نہیں پہنچا،[4] شاعری کی یہ صنف اندلس اور مشرق میں نہایت مقبول ہوئی۔

العقد الفرید ابن عبد ربہ نے العقد الفرید جیسی بیش قیمت کتاب تالیف کر کے ادب عربی کی گراں مایہ خدمت انجام دی ہے، بقول جرجی زیدان[5] یہ کتاب اس زمانے کا دائرۃ المعارف یعنی تمام علوم کا مخزن ہے، اس میں بہت سی مفید باتیں، متفرق مسائل، مختلف واقعات، انساب، امثال، طب، موسیقی، شعر و شاعری، تاریخ و جغرافیہ کے متعلق معلومات جمع کر دی گئی ہیں اس نے صرف عربوں کی تصانیف پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ یونانی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کے تراجم سے بھی استفادہ کیا ہے، مصنف نے اپنی کتاب کو پچیس[25] ابواب میں

[1] عبداللہ ابن المعتز اور ابن عبد ربہ کے ارجوزوں کا مطلع یوں ہے:

الحمد لله على آلائه احمده والحمد من نعمائه (دیوان ابن المعتز)

فالحمد لله على اغمائه حمدا اجزيلا على نعمائه (العقد ۵، ۲۲۵)

[2] زیات، ۳۱۸ [3] العقد، ۵: ۲۲۵، ۲۲۶ [4] مقدمہ ابن خلدون، ۵۸۴

[5] جرجی زیدان، ۲: ۲۰۲.

تقسیم کیا ہے، پھر اس نے تمام مواد ہار کے موتیوں کی طرح مرتب کیا ہے، اور ہر "باب" کے نام کسی قیمتی پتھر یا جوہر پر رکھا، درمیانی یعنی تیرہویں باب کا نام "الواسطہ" (یعنی درمیان کا موتی) رکھا ہے، اس کے بعد بالترتیب "الثانیہ" کی زیادتی کے ساتھ وہی نام ہیں جو پہلے بارہ[12] ابواب کے ہیں، یاقوت نے ان ابواب کی ترتیب کچھ مختلف بتائی ہے[1]۔

مؤلف نے ابواب باندھنے اور مضامین کو ترتیب دینے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے وہ پہلے اس باب کی غرض و غایت بتاتا ہے پھر اس موضوع پر بہترین مواد جمع کر کے اسے عمدہ طریقے سے ترتیب دیتا ہے۔

تالیف کا مقصد | ابن عبد ربہ نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کا ارادہ کیا جس میں ہر علم اور ہر فن پر نادر معلومات فراہم ہوں، وہ خود کہتا ہے: میں نے اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں جملہ فنون متفرق و منتشر ہیں، چنانچہ میں نے پیش نظر کتاب میں عوام و خواص کی نادر یا تیں یکجا کر دیا ہے[2]۔

العقد الفرید مرتب کرتے وقت اس نے ابن قتیبہ کی معرکہ آرا تصنیف عیون الاخبار کا تتبع کیا ہے، اس کے علاوہ اس نے اصمعی، ابو عبید اور جاحظ وغیرہ کی تصانیف اور قرآن، حدیث تورات اور کتب مقدس سے بھی استفادہ کیا ہے، بعض مواقع پر وہ دوسرے مصنفین کے پورے ابواب مثلاً کتاب الکامل کا باب الخوارج من وعن نقل کر جاتا ہے، لیکن عموماً وہ نوادر کو منتخب کر کے انھیں نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے[3]۔

ترتیب و تبویب میں جو مشکلات اسے پیش آئیں، اس کا اظہار یوں کرتا ہے:

---

[1] یاقوت نے ۲۳ ویں باب کی جگہ ۲۵ ویں باب کو اور ۲۵ ویں باب کی جگہ ۲۳ ویں باب کو دی ہے (۴:۴)

[2] العقد ۱ : ۳ [3] العقد ۱ : ۲ ۔

واختیار الکلام اصعب من تالیفہ[1]۔

کلام کا انتخاب کرنا مستقل تالیف سے زیادہ دشوار ہے۔

ابن عبد ربہ کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ وہ جو کچھ انتخاب کرے عام سطح سے بلند اور علمی و ادبی لحاظ سے ارفع ہو تاکہ لوگ اسے عامی یا سوقی نہ سمجھیں، غالباً نوادر کے انتخاب میں اس کے سامنے افلاطون کا یہ نظریہ بھی تھا:

عقول الناس مدونۃ فی اطراف اقلامھم وظاھرۃ فی حسن اختیارھم[2]

لوگوں کی عقلیں ان کے اقلام اور تحریروں میں مدون ہوتی ہیں اور ان کے حسن انتخاب سے وہ نمایاں ہوتی ہیں۔

گویا کہ اس نے تمام معلومات کا انتخاب:

الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ[3]

جو لوگ بات کو توجہ سے سنتے ہیں پھر عمدہ کو اختیار کرتے ہیں۔

کے مطابق رطب و یابس کو چھوڑ کر ہر عالم کے بہترین کلام کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔

اس انتخاب اور حسن ترتیب نے لوگوں کو اس کا مداح بنایا ہے اور اسے اس کی اس کتاب ہی نے شہرت دوام بخشی ہے، ادب عربی ابن عبد ربہ کا ممنون ہے کہ اس نے یہ عمدہ ہار پیش کر کے عربی ادب کی گراں مایہ خدمات سرانجام دی ہیں، لہٰذا ہر دور کے ادبا اور علما اسے عقیدت کے پھول پیش کرتے ہیں، ابن الفرضی اسے شاعر الاندلس و ادیبہا کہتا ہے[4]، فتح بن خاقان حجۃ الادب[5] کے نام سے یاد کرتا ہے، ضبی کہتے ہیں:

---

[1] العقد ۱ : ۲ [2] ایضاً [3] القرآن ۳۹ : ۱۹ [4] ابن الفرضی ۱ : ۳۷

[5] مطمح، ۵۱۔

هو من اهل العلم والادب والنظر[1] — وہ صاحب علم وادب ونظر تھا۔

اور ثعالبی اسے ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں:

احد محاسن الاندلس علماً وفضلاً ونبلاً[2] — وہ علم وفضل اور شرافت کے لحاظ کو اندلس کے بہترین لوگوں میں تھا۔

کتاب کی اہمیت العقد کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن عبدربہ کا میلان مزاح اور ذکاوت کی طرف زیادہ تھا، چنانچہ اس نے مزاح کے لئے ایک مستقل باب وقف کیا ہے، جس کے آغاز میں وہ کہتا ہے:

هی نزهة النفس وربیع القلب ومرتع السمع ومجلب الراحة ومعدن السرور، فان القلوب اذا كلت عمت[3] — یہ نفس کی سیرگاہ، قلب کی فصل بہار، کان کی چراگاہ، اور راحت وسرور کا خزانہ ہے، کیونکہ قلوب جب تھک جاتے ہیں، تو اندھے ہو جاتے ہیں۔

پھر اپنے اس قول کی تائید میں احادیث بھی بیان کرتا ہے، مثلاً:

روّحوا القلب ساعة بعد ساعة[4] — وقفہ وقفہ سے قلب کو فرحت وتازگی بخشو۔

اس کے علاوہ وہ قصے کہانیاں بھی بیان کرتا ہے، مثلاً دارۃ جلجل[5] کا واقعہ، صریع الغوانی[6] کا قصہ وغیرہ، ان کے علاوہ وہ الف لیلۃ ولیلۃ کے قصے بھی بیان کرتا ہے، ابن عبدربہ پہلا شخص ہے جس نے مختلف دور کے قصے کہانیوں کو ایک کتاب میں مدوّن کیا، اسی طرح وہ نوادر وغیرہ کا بھی ذکر کرتا ہے، گو مزاح کا پہلو اس کی کتاب کے اکثر ابواب میں غالب ہے، لیکن اس کے

[1] الضبی، ۱۳۷ [2] یتیمۃ الدہر ۲: ۶۵ [3] العقد ۸، ۶: ۸۱ [4] الجامع الصغیر ۲: ۳۱، العقد الفرید ۸: ۸۱ [5] العقد ۸: ۹۱ [6] العقد ۸: ۹۳۔

ساتھ ہی ہر باب میں اس کا بنیادی مقصد علمی وادبی تھا، ابن عبدربہ اپنی کتاب میں مختلف علوم وفنون جمع کرنے کی غرض بھی یہی بتاتا ہے کہ وہ ایک ادیب کی حیثیت سے اسی کو ایک ادبی شہ پارہ بنانا چاہتا ہے، وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں ابن قتیبہ کا یہ قول نقل کرتا ہے:

ومن اراد ان یکون ادیباً فلیتفنن فی العلوم[1] — جو ادیب ہونا چاہے تو اس کو علوم میں مہارت حاصل کرنی چاہئے۔

اسی ادبی مقصد کے پیش نظر وہ اکثر روایات بیان کرتے ہوئے اسناد حذف کر جاتا ہے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے:

اخبار ممتعة وحكم ونوادر لا ینفعها الاسانید باتصاله ولا یضرها ما حذف منها[2] — دلچسپ خبروں اور انوکھی حکمتوں کو متصل سندوں سے بیان کرنے میں فائدہ نہیں اور نہ سندیں حذف کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔

وہ طویل وبسیط کہانیوں اور روایات کو نہایت مختصر انداز میں بیان کرتا ہے[3]، اس طرح ابن عبدربہ اپنے سے پہلے کے مصنفین سے کئی لحاظ سے مثلاً اختصار، تبویب، سہولت الفاظ اور مافی الضمیر کے اظہار میں سبقت لے گیا، اس کا ادبی مقصد کتاب کے ابواب پر نظر ڈالنے ہی سے نمایاں ہوجاتا ہے، جو علمی وادبی فوائد کا خزینہ ہیں۔

تاریخی اہمیت یہ کتاب ایک قسم کا دائرۃ المعارف یعنی انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں اس وقت کے تمام مروّجہ علوم کو جمع کر دیا گیا ہے، اس کا شمار قدیم مصادر میں کیا جاتا ہے، اس سے عربوں کے اجتماعی، سیاسی، معاشی اور ادبی حالات کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کے مطالعہ سے بعض ایسی نادر کتابوں کا بھی علم ہوتا ہے جو دست برد زمانہ کی نذر ہوگئی ہیں، مثلاً بقول قلقشندی ابوعبیدہ کی

[1] العقد ۲: ۶۵ [2] العقد ۱: ۲ [3] العقد ۱: ۲، ۳

کتاب الامثال کا اکثر و بیشتر حصہ اس میں نقل کر دیا گیا ہے[۱]، اسی طرح الشیبانی، التیمی، المدائنی
العتبی وغیرہ کی روایات اس میں محفوظ ہیں، جرجی زیدان کتاب کی تاریخی اہمیت بیان
کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں بعض ایسے تاریخی واقعات ملتے ہیں جو دوسری تاریخ کی
کتابوں میں ناپید ہیں، مثلاً زیاد، حجاج اور آل ابی طالب کے حالات بڑی شرح و بسط
سے بیان کئے گئے ہیں، اور بقول اس کے:

وھو من امہات کتب الادب الموثوق بھا[۲]　　وہ ادب کی قابل اعتبار کتابوں میں ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے العقد میں ایک نقص ضرور نظر آتا ہے، وہ یہ کہ مؤلف اسناد پر
توجہ نہیں دیتا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ کتاب کا اصل مقصد ادبی ہے، لہٰذا یہ
عیب زیادہ قابل التفات نہیں رہتا، دوسری چیز جو بطور مورخ اس کے رتبہ کو کم کرتی ہے
وہ یہ ہے کہ ابن عبد ربہ خبریں بیان کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیتا، ایک موقع پر لکھتا ہے
کہ یزید اپنے باپ معاویہ کی وفات کے وقت اس کے پاس تھا[۳]، لیکن دوسری جگہ اس سے
انکار کرتا ہے[۴]۔

علوم دینیہ کے مآخذ کے اعتبار سے بھی العقد الفرید بڑی اہمیت کی حامل ہے، وہ فقہا
اور ائمہ کے اقوال و فتاوی کا ذکر، نیز دیگر شرعی امور میں ان کے اختلافات کی طرف بھی
اشارہ کرتا ہے، اس کے علاوہ قرآن مجید کی بعض آیات اور احادیث نبوی کی تفسیر بھی
بیان کرتا ہے۔

زمانۂ تالیف　العقد کے زمانۂ تالیف کی صحیح تعیین ایک مشکل امر ہے، لیکن بعض شواہد سے

۲۳

۱۔ صبح الاعشٰی ج ۱ ص ۳۹۳　۲۔ جرجی زیدان تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۲۰۲　۳۔ العقد ۳: ۱۶۶　۴۔ العقد ۳:

پتہ چلتا ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنی زندگی کے آخری ایام اور غالباً ۳۲۲ھ میں تصنیف کی،
کیونکہ اس نے عبد الرحمن کے عہد کے حالات کے بارے میں جو ارجوزہ لکھا ہے، اس میں ۳۲۲ھ
تک کے حالات مذکور ہیں، لیکن مؤلف خود ۳۲۸ھ تک زندہ رہا، اگر اس بات کو تسلیم نہ کیا جائے
تو یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنی کتاب میں ترمیم و اضافہ کرتا رہا، اس کا ثبوت اس سے بھی
فراہم ہوتا ہے کہ وہ عبد الرحمن الناصر کو "الناصر لدین اللہ" اور "امیر المومنین" کے القاب سے یاد کرتا ہے[۱]
اور یہ خطابات اسے ۳۱۶ھ میں عطا ہوئے۔

العقد میں رد و بدل　دوسری کتابوں کی طرح العقد میں بھی مؤلف کی موت کے بعد کچھ اضافے
تکملے کے طور پر کئے گئے، جو ابن عبد ربہ ہی کی طرف منسوب ہیں، مثلاً کتاب "الیتیمۃ الثانیہ" میں
بغداد کے چار عباسی خلفاء الراضی، المتقی، المستکفی، اور المطیع کا ذکر ہے، حالانکہ ان چاروں نے
۳۲۸ھ کے بعد وفات پائی[۲]۔

کتاب کا نام　آج کل علمی حلقوں میں یہ کتاب العقد الفرید کے نام سے معروف ہے، لیکن بعض
ناقدین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مؤلف نے اس کا نام العقد رکھا تھا اور صفت
الفرید کا اضافہ بعد میں ہوا، سب سے پہلے اس خیال کا اظہار بروکلمین نے کیا[۳]، دلیل میں وہ
قدیم مصادر کو پیش کرتا ہے، جن میں الفرید کا لفظ مستعمل نہیں، ضبی کہتا ہے: ولہ الکتاب
الکبیر والمسمّی کتاب العقد فی الاخبار[۴]۔ ابن خاقان کہتا ہے: لہ التالیف المشہور
الذی سمّاہ بالعقد[۵]، یاقوت بھی اسے صاحب کتاب العقد فی الاخبار کے نام سے یاد

۱۔ Spanish Islam. P. 423　۲۔ الراضی (۳۲۲ھ – ۳۲۹ھ) المتقی (۳۲۹ھ – ۳۳۳ھ) المستکفی (۳۳۳ھ – ۳۳۴ھ) المطیع (۳۳۴ھ – ۳۶۳ھ)　۳۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ۲: ۳۸۳　۴۔ الضبی، ۱۳۷　۵۔ مطمح، ۵۱　۶۔ یاقوت، ۲: ۶۷۔

کرتا ہے، قلقشندی[۱۲] اور حاجی خلیفہ[۱۳] بھی اس کی کتاب کو العقد ہی کہتے ہیں، اب صرف ایک کتاب المستطرف باقی رہتی ہے، جس میں مصنف کہتا ہے کہ میں نے اپنی اس کتاب میں اکثر حصہ العقد الفرید سے نقل کیا ہے[۱۴]، گو ہم صحیح وقت کی تعیین نہیں کر سکتے کہ کب العقد کے ساتھ صفت الفرید کا اضافہ ہوا ہے، لیکن بعض واقعات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ نام وزیر شافعی کی تالیف العقد الفرید لملک الشعراء[۱۵] سے پہلے معروف نہ تھا اور ہمارے خیال میں صاحب مستطرف اگر پہلا شخص نہیں تو قدیم ترین شخص ہے جس نے اس کی کتاب کو العقد الفرید کہا ہے۔

اختصار العقد الفرید کا اختصار دو دفعہ ہو چکا ہے، سب سے پہلے ابو اسحاق ابراہیم[۱۶] بن عبد الرحمٰن نے کیا، پھر ابن منظور صاحب[۱۷] لسان العرب نے، لیکن یہ دونوں ضائع ہو چکے ہیں، حال ہی میں مصر سے ایک مختصر ایڈیشن طبع ہوا ہے تاکہ نصاب میں شامل کیا جا سکے، یہ مختار العقد کے نام سے مشہور ہے، ۱۹۱۳ء میں مطبع جمالیہ سے شائع ہوا۔

بعد میں آنے والے ادباء نے العقد الفرید سے استفادہ کیا، ان میں سے ایک الابشیہی (م ۸۵۰ھ) صاحب المستطرف ہے، وہ مقدمہ میں کہتا ہے: نقلت کثیرا مما نقلہ ابن عبدہ فی کتابہ[۱۸]۔ صاحب خزانۃ الادب نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ کتابیں جن سے اس نے فائدہ اٹھایا، ان میں العقد بھی شامل ہے، اسی طرح ابن خلدون بھی اپنے مقدمہ میں اکثر العقد کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان کے علاوہ قلقشندی اور نویری نے بھی اس کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ ان کے علاوہ متاخرین میں سے جنھوں نے نوادر پر کتب تالیف کیں، سب نے العقد الفرید پر اعتماد کیا ہے۔

---

[۱۲] صبح الاعشیٰ ۱: ۳۹۳، ۹: ۳۶۲ [۱۳] حاجی خلیفہ ۴: ۲۳۲ [۱۴] المستطرف [۱۵] حاجی خلیفہ ۴: ۲۳۲،

[۱۶] ابو اسحٰق م ۵۸۶ھ بغیۃ الوعاۃ ۱۸۲ [۱۷] ابن منظور م ۷۱۱ھ بغیۃ الوعاۃ ۱۰۶ [۱۸] المستطرف ۱: ۲۔

ابن عبد ربہ کی تصنیفات میں سے صرف العقد الفرید ہم تک پہونچی ہے، حمیدی نے ابن عبد ربہ کے اشعار کے بیس اجزاء دیکھے تھے[۱۹]، لیکن وہ ہم تک نہیں پہونچے، اس کے علاوہ حاجی خلیفہ نے اس کی ایک اور کتاب العرفۃ فی العلم والادب[۲۰] کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ کتاب بھی ہم تک نہیں پہونچی۔

طباعت العقد الفرید متعدد بار قاہرہ سے چھپی، پھر ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۵ء مکتبہ صادر بیروت سے یہ کتاب چھپتی رہی، یہ ایڈیشن تیئیس[۲۳] اجزاء پر مشتمل ہے، کرم لبنانی نے اسے شائع کیا ہے بہت سی اغلاط کو صاف کیا ہے۔ اور حواشی بھی دئے ہیں۔

اس کے بعد محمد سعید العرافات نے نہایت صحت و دقت نظر سے اس کتاب کو مطبعہ استقامہ سے شائع کیا، وہ اغلاط جو ابتدائی ایڈیشنوں میں نظر آتے ہیں، وہ کافی حد تک اس ایڈیشن میں صاف کر دئے گئے ہیں، میں نے بھی اسی ایڈیشن پر انحصار کیا۔

---

[۱۹] یاقوت ۲: ۶۷ [۲۰] حاجی خلیفہ ۵: ۳۰۲۔

غالب

مدح و قدح کی روشنی میں

غالب پر مولانا الطاف حسین حالی کی بے مثل کتاب یادگار غالب سے لے کر غالب صدی تک بیشمار کتابیں اور مضامین کے مجموعے اور رسالوں کے خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں اور غالبیات اردو ادب کا ایک مستقل موضوع بن گیا ہے، جس پر اہل نظر داد سخنوری دیتے رہتے ہیں، دار المصنفین کی یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک اہم کتاب ہے، جس میں مرزا غالب کی زندگی سے لے کر ۱۹۲۸ء تک ان کی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، اس کا دوسرا حصہ جو زیر طبع ہے، اس میں ۱۹۲۸ء کے بعد سے غالب صدی تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر نقد و تبصرہ ہوگا ——— مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔

لاہور کے علمی تحائف

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

معارف کے گذشتہ صفحات میں زیادہ تر ان مطبوعات کا ذکر آیا ہے، جو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع ہوئی ہیں، ابھی ذاتی کتابوں کا ذکر باقی رہ گیا ہے جن کی تفصیلات بیان کرنے میں کئی مہینے صرف ہوں گے، مگر خوشی اس کی ہے کہ یہ سلسلہ دلچسپی سے پڑھا جارہا ہے اور تقاضا ہے کہ یہ ابھی جاری رہے، تاکہ سرحد کے اس پار کی علمی و ادبی سرگرمیاں معلوم ہوسکیں، جی تو چاہتا ہے کہ ان مطبوعات پر سیر حاصل ناقدانہ تجزیہ بھی ہو، مگر یہ ممکن نہ ہو سکے گا، کیونکہ پھر یہ سلسلہ بہت طویل ہو جائے گا، اس لئے آئندہ میری تحریر میں زیادہ تر تعارفی اور تاثراتی رنگ ہوگا۔

نقوش کا اقبال نمبر: لاہور میں رسالہ نقوش کے مدیر جناب طفیل صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، علامہ محمد اقبال کے جشن کی کارروائی کے موقع پر تو دو تین ملاقاتیں محض سرسری رہیں، مگر ان کی پہلی ملاقات ہی میں کشش اور جاذبیت محسوس ہوئی، انھوں نے اپنے یہاں ایک علمی مجلس بھی منعقد کی تھی، اصرار سے مجھ کو بھی بلایا تھا، مگر مجھ کو کراچی پہونچنے کی عجلت تھی، اس لئے اس میں شرکت نہ کر سکا، کراچی سے لاہور واپس آیا تو معذرت خواہ بن کر ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا، مگر وہ خود ملنے چلے آئے، میں جناب حکیم سعید دہلوی کی عنایت سے ہمدرد دواخانہ کی شاخ لاہور میں مقیم تھا، وہیں ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، ان کی صحیح عمر تو نہیں بتا سکتا مگر وہ پورے جوان نظر آئے، اسی کے ساتھ ایک مدیر کی حیثیت سے جواں مرد، جواں ہمت، جواں حوصلہ اور جواں دل بھی، جب وہ میرے سامنے بیٹھ کر سنجیدہ اور متین لہجہ میں باتیں کر رہے تھے، تو مجھ کو ایسا معلوم ہورہا تھا کہ میں ایک الٰہ دین کے پاس بیٹھا ہوں، جس کے پاس ایک طلسمی چراغ ہے، اسی سے وہ جن کو نکال کر اس کی مدد سے نقوش کے ضخیم خاص نمبر شائع کیا کرتے ہیں، انھوں نے اب تک جتنے خاص نمبر نکالے ہیں، ذرا ان کی تفصیلات سنئے :—

(۱) غزل نمبر ۷۵۲ صفحے (۲) افسانہ نمبر دو جلدیں ۱۰۹۰ صفحات (۳) مکاتیب نمبر دو جلدیں ۱۰۲۸ صفحات (۴) طنز و مزاح نمبر ۹۸۰ صفحات (۵) لاہور نمبر ۱۲۰۴ صفحات (۶) ادب عالیہ نمبر ۱۲۷۲ صفحات (۷) آپ بیتی نمبر دو جلدیں ۱۹۶۴ صفحات (۸) شخصیات نمبر دو جلدیں ۱۵۱۴ صفحات (۹) خطوط نمبر تین جلدیں ۱۷۲۰ صفحات (۱۰) غالب نمبر تین جلدیں، ۱۸۵۶ صفحات (۱۱) اقبال نمبر تین جلدیں ۱۸۲۲ صفحات (۱۲) پطرس نمبر ۶۴۰ صفحات (۱۳) منٹو نمبر ۴۸۰ صفحات (۱۴) شوکت نمبر۔ ان کے علاوہ متعدد سالنامے اور خاص نمبر اور ہیں، ان خاص نمبروں کے صفحات کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ الٰہ دین کے چراغ کے جن ہی کے ذریعہ سے کاغذ بھی فراہم کر لیتے ہیں، کاتب بھی ان کو مل جاتے ہیں، اچھی چھپائی کا بھی انتظام ہو جاتا ہے، فرمے بھی آسانی سے موڑ لئے جاتے ہیں اور ان کی جزبندی بھی ہو جاتی ہے اور ان کو ان کے چراغ کا جن دردسر تک بھی ہونے نہیں دیتا، ورنہ ایک رسالہ کی کتابت و طباعت میں جو پریشانیاں ہوتی ہیں، ان کا اندازہ اس کا ایک مدیر ہی کر سکتا ہے، عام طور سے کسی کی قدر اس کی وفات کے بعد ہی کی جاتی ہے، مگر نقوش کے مدیر جناب طفیل صاحب نے اپنے اس رسالہ کے ذریعہ سے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کی قدر علمی و ادبی حلقہ میں برابر ہورہی ہے، آئندہ ان پر مقالے اور شاید کتابیں بھی لکھی جائیں، کہ انھوں نے علمی خدمت کرنے کا ایک نیا جذبہ دیا، لگن پیدا کرنے کی راہ دکھائی، مشکل کام کو

آسان کرنے کا سلیقہ سکھایا، مضمون نگاروں کو اکسا کر ان کو مضامین لکھوانے پر آمادہ کرنے کا ڈھنگ بتایا، جب ان کے سارے خاص نمبروں پر ایک ساتھ نظر ڈالی جائے گی تو اس سے ہر شخص کو اتفاق ہوگا کہ انھوں نے علم و ادب اور فکر و فن کے جواہر پاروں کو سمیٹ سمیٹ کر خوب اچھی طرح بانٹنے کی کوشش کی ہے، اور جب بھی یہ پڑھے جائیں گے تو ان سے نظر و فکر کی جلا ضرور ہوگی،

طفیل صاحب نے نقوش کے اقبال نمبر کی دو جلدیں خاص طور سے پیش کیں جو ۱۲۲۸ صفحات کی ہیں، ان کے علاوہ ایک جلد اور شائع کرنے والے تھے جو شاید اس وقت تک چھپ چکی ہوگی، ان میں اس برصغیر کے مقالہ نگاروں کے ۸۲ مضامین ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ ان میں وہ ساری چیزیں ہیں، جو پہلے سے معلوم تھیں اور وہ بھی ہیں جو اب تک معلوم نہیں ہو سکی تھیں، مضامین میں بڑا تنوع ہے، اقبال کی حیات، اقبال بارگاہ رسالت میں، اقبال چند عاشقان رسول کے حضور، اقبال اور روحانیت، اقبال کا نظام فکر، اقبال کا نظریۂ تاریخ، اقبال کا مثالی انسان، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، اقبال اور آرزوئے نایافت، اقبال کا تصور قرآنی، اقبال اور ملت اسلامیہ وغیرہ کے عنوانات سے اندازہ ہوگا کہ ان دو جلدوں میں کیا کیا چیزیں پیش نہیں کی گئی ہوں گی، میری نظر اس حصہ پر زیادہ گئی جس کی سرخی "اقبال جن سے متاثر ہوا" ہے، "متاثر ہوا" کے بجائے اگر "متاثر ہوئے" لکھا جاتا تو علامہ محمد اقبال کی پوری تعظیم کا بھی اظہار ہو جاتا، اس حصہ میں تین مضامین کو بہت شوق سے پڑھا، ایک تو ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ کا مضمون جو "اقبال اور ابن عربی" کے عنوان سے ہے، ڈاکٹر صاحب کی تحریر کی بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں توازن، تناسب اور اعتدال ہوتا ہے، یہ مضمون بھی اسی کا ایک نمونہ ہے، ڈاکٹر صاحب علامہ محمد اقبال کو

وحدت الوجود کا منکر ثابت کرتے ہیں، اس مسئلہ کے بہت بڑے حامی ابن عربی تھے، جن کی بہت سخت مخالفت بعض حلقوں میں کی گئی ہے، ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ ابن عربی کی مخالفت اس لئے نہیں کرتے ہیں کہ ان کی مخالفت مختلف گوشوں سے ہوتی رہی ہے، بلکہ انھوں نے ابن عربی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبال کو ابن عربی سے محض اس لئے اختلاف نہیں تھا کہ وہ وحدت الوجود کے قائل تھے، بلکہ اس لئے تھا کہ ان کا نظام فکر یونانیت اشراقیت اور مجوسی اثرات کا مرکب ہے، ان کی زبان بھی رمزی ہے، جب وہ اس زبان کا استعمال قرآن کی تفسیر میں کرتے ہیں تو قرآن مجید کی روح کو نقصان پہونچتا ہے، ابن عربی کے نزدیک ہر شے کا ظاہر ہے اور ایک باطن بھی، چنانچہ ان کے نزدیک قرآن مجید کے الفاظ کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، بس یہیں سے علامہ اقبال کا ابن عربی سے اختلاف شروع ہو جاتا ہے اس کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ علامہ کا اختلاف ابن عربی سے محض وحدت الوجود کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ اس کشف خاص کو مسئلہ عام بنا دیا، اگر محض وحدت الوجود مد نظر ہوتی تو وہ حسین بن منصور حلاج کے بھی اتنے ہی مخالف ہوتے جتنے ابن عربی کے ہیں، مگر حلاج کے معاملہ میں وہ مثل قدیم صوفیہ کے اس لئے رواداری برتتے ہیں کہ اس کا اعلان انا الحق جذبۂ خاص کر نمودار ہو کر اس کی ذات تک محدود رہا

ڈاکٹر صاحب نے وحدت الوجود کے شہید اعظم منصور حلاج کا ذکر تو کر دیا ہے، لیکن علامہ محمد اقبال نے حلاج سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی زیادہ تفصیل نہیں لکھی ہے، اگر حلاج اور اس کے نعرۂ انا الحق سے متعلق علامہ محمد اقبال کی پوری رائے کا تجزیہ کیا جائے تو پھر یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے مخالف تھے، گلشن راز جدید میں وہ یہ سوال کرتے ہیں:

کدامی نکتہ را نطق است انا الحق　　چہ گوئی ہرزہ بود آں رمز مطلق

اس کے جواب میں رمز انا الحق کی تشریح کرتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں :

بخودگم بہر تحقیق خودی شو　　انا الحق گوے و صدیق خودی شو

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی خودی کی تکمیل انا الحق ہی کے ذریعہ سے کرنا چاہتے تھے ،

جاوید نامہ میں حلاج کی نوا تو بہت گونجی ہے ، اس کی زبان سے علامہ اقبال کہتے ہیں :

نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست　　جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست

اور نظیری کا یہ مصرع بھی نقل کرتے ہیں :

کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

پھر حلاج کی یہ تصویر کھینچی ہے :

مرد آزادے کہ داند خوب و زشت　　می نگنجد روح او اندر بہشت

اس کے عشق کی یہ نوعیت بتائی ہے :

عشق آزاد و غیور و ناصبور　　در تماشائے وجود آمد جسور

عشق با زشکوہ ہا بیگانہ ایست　　گرچہ اور اگریۂ مستانہ ایست

اس کی زندگی کی خلش کا لب لباب یہ بتایا ہے :

بے خلشہا زیستن نا زیستن　　باید آتش در تہ پا زیستن

زیستن ایں گونہ تقدیر خودی ست　　از ہمیں تقدیر تعمیر خودی است

یعنی آتش عشق ہی سے حلاج کی خودی کی تقدیر کی تعمیر ہوئی ، اس نے نار حیات میں جل کر

اسرار حیات بتایا :

من بخود افروختم نار حیات　　مردہ را گفتم ز اسرار حیات

اس کی زبان سے اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ایک گناہ کیا ، لیکن اسی گناہ کے ذریعہ

نور و نار کی خبر پہونچائی :

من ز نور و نار او دادم خبر　　بندۂ مجرم ! گناہ من نگر !

حلاج ہی کی زبان سے کہتے ہیں کہ بندگی کا راز الا اللہ ہی میں ہے :

کس ز سر عبدہٗ آگاہ نیست　　عبدہٗ جز سر الا اللہ نیست

لا الہ تیغ و دم او عبدہٗ　　فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ

اس نعرہ کا اعجاز حلاج کی زبان سے یہ بتاتے ہیں ،

اے خنک مردے کہ از یک ہوئے او　　نہ فلک دارد طواف کوئے او

مگر ان کے خیال میں اس نعرہ کی خوبی یہ ہونی چاہئے :

وائے درویشے کہ ہوئے آفرید　　باز لب بربست و دم در خود کشید

اس سلسلہ میں اقبال یہ بھی کہتے ہیں :

اگر فردے بگوید سرزنش بہ　　اگر قومے بگوید نا روا نیست

مگر حلاج کی زبان سے بھی یہ ادا کرتے ہیں کہ :

چاک کن پیراہن تقلید را　　تا بیاموزی از و توحید را

توحید کی انتہا ہی اسلامی وحدت الوجود ہے . بشرطیکہ اس میں خواہ مخواہ کی عیاشانہ ذہنی

آمیزش نہ ہو ، حلاج سے متعلق اقبال کے خیالات کا اندازہ ان کے اس شعر سے بھی ہوگا .

بود حلاجے بشہر خود غریب　　جاں ز ملا برد و کشت او را طبیب

اور جو یہ کہہ گئے ہیں ، اس کے کیا معنی ہیں :

کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند　　بندۂ حق را بدار آویختند

منصور حلاج سے متعلق اقبال کے ان خیالات کے بعد یہ کیسے یقین کیا جائے کہ وہ وحدت الوجود کے

منکر تھے، پھر انھوں نے جو یہ کہا ہے:

جہانِ دل جہانِ رنگ و بو نیست   درو پست و بلند و کاخ و کو نیست

زمین و آسمان و چار سو نیست   دریں عالم بجز اللہ ہو نیست

اس میں وحدت الوجود ہی کی تو ترویج ہے، اردو میں بھی ان کے ایسے اشعار بہت ملیں گے

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو   پلا کے مجھ کو مئے لا الہ الا ہو

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے   صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری   نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

خودگیری و خودداری و گلبانگ انا الحق   آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر   اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی   کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری   ترے بدن میں اگر سوز لا الہ نہیں

علم کا موجود اور فقر کا موجود اور   اشہد ان لا الہ اشہد ان لا الہ

ایک جگہ تو تفریحاً اپنے متعلق یہ بھی کہہ گئے ہیں: ؎

پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی

علامہ اقبال نے اپنی کتاب "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں حلاج کے نعرہ انا الحق کو واردات باطن کے کمال کی معراج تصور کیا ہے، اور وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان الفاظ میں متکلمین کے لئے ایک چیلنج ہے۔ (انگریزی ایڈیشن ص ۹۶)۔

منصور حلاج اور انا الحق سے متعلق علامہ اقبال کی ان خیال آرائیوں کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ رائے ذرا محل نظر ہو جاتی ہے کہ وحدت الوجود کے مسئلہ پر علامہ اقبال کے خیالات سب کو معلوم ہیں، انھوں نے اپنی نظم و نثر میں اس تصور کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے، علامہ اقبال کے نزدیک وحدۃ الوجود کا عقیدہ درست نہیں (نقوش ص ۱۱۲، ۱۲۰۳)

بانگ درا میں ایسی کئی نظمیں ہیں جن سے ظاہر ہے کہ اقبال پر وحدت الوجود کا اثر رہا، ان کا کچھ دور ایسا ضرور گزرا جب اس عقیدہ سے منحرف ہوتے نظر آتے ہیں، لیکن ان کے آخری دور کی نظموں میں یہ اثر پھر قائم ہو گیا، جیسا کہ اوپر کے اشعار سے معلوم ہوگا، خود ڈاکٹر سید عبداللہ نے اعتراف کیا ہے کہ اقبال کے اپنے افکار میں متناہی کا لامتناہی تک پہونچ جانا ممکن ہے، کیونکہ خودی کی غایت بھی یہی ہے (نقوش ص ۱۲۵) یہ کیا ہے، وحدت الوجود ہی تو ہے، علامہ اقبال کے کلام میں عشق کی سرشاریوں کی بڑی فراوانی ہے، یہ عشق کسی لیلیٰ، کسی عذرا، کسی شیریں، کسی قلوپطرا کے لئے تو نہیں، یہ عشق الٰہی ہی کی سرشاریاں ہیں، جس کا دوسرا نام وحدت الوجود ہے، اسی کے ساتھ میری ذاتی رائے ہے کہ اقبال نے جس طرح اسلام کو سمجھنے کے لئے ایک نیا طرز فکر دیا، علم کلام کی ایک نئی تعبیر کی، تصوف کے لئے ایک نئی روح پھونکی اسی طرح بگڑی ہوئی وحدت الوجود کو سنوار کر کے ایک نئی وحدت الوجود کا درس دیا ہے، جس کو ان کی اپنی وحدت الوجود کہنا صحیح ہے، پرانے وحدت الوجودی اپنے کو خدا میں جذب کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اقبال نے خدا کو اپنے میں جذب کرنے کی تعلیم دی ہے، پرانے وحدت الوجودی خدا کی تلاش کرتے ہیں، اقبال کا خیال ہے کہ خدا خود آدمی کی تلاش میں ہے، پرانے وحدت الوجودی خدا کی رضا کے طالب ہوتے ہیں، اقبال آدمی کی خودی کو اتنا بلند کرنا چاہتے ہیں کہ خود خدا اس سے پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے، اقبال کا خیال ہے کہ خود خدا نے آدمی کو کھو دیا ہے

ما ز خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو است   چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو است

آدمی خدا کی تلاش میں نہیں بلکہ خود خدا آدمی کو لالہ کے حسن، نرگس کی آنکھوں، پرندوں کے چہچہوں
پھولوں کی خوشبوؤں، چاند، آفتاب، محلوں اور وادیوں میں تلاش کرتا رہتا ہے، زندگی کا موتی
انسان کے خاکی جسم میں گم ہوگیا ہے، اور یہ فیصلہ کرنا ہے کہ دنیا آدمی ہے یا خود خدا ہے:

در خاکدان ما گہر زندگی گم است — این گوہرے کہ گم شدہ مائیم کہ اوست

یہ کیا ہے، اس کو ہمہ اوست یا ہمہ از اوست جو چاہے کہہ لیجئے۔ اقبال پرانے وحدت الوجود
کی طرح پیوستن کے بجائے گسستن کے قائل ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں فراق میں وصال سے
زیادہ لذت ہے۔ وہ شکوۂ تقدیر یزداں بھی پسند نہیں کرتے، بلکہ وہ تقدیر یزداں بننے
کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کشتۂ لذت پیکار بن کر ابد کو تسخیر کرنے کا پیام دیتے ہیں، وہ دونوں
جہان کو اپنے شعلہ کی محض موج دخان بن کر اپنے کو جاوداں دیکھنا پسند کرتے ہیں، انھوں نے
خود خدا کی زبان سے انسان کو گویا الوہیت کا درجہ دے دیا ہے۔ خدا انسان کو مخاطب
کرکے کہتا ہے:

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

اس کا جواب انسان عاجز محض ہو کر نہیں دیتا ہے، بلکہ خدا کی عطا کی ہوئی شان الوہیت
کے ساتھ اپنی آفرینش کا بھی دعویدار ہوتا ہے:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم — سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از ابر نوشینہ سازم

علامہ اقبال بندہ اور بندہ کے خدا دونوں کو ایک دوسرے کا مطلوب اور لازم ملزوم سمجھتے ہیں

نہ او را بے نمود ما کشودے — نہ ما را بے کشود او نمودے

اسی کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں:

نہ ما را در فراق او عیارے — نہ او را بے وصال ما قرارے

وحدت اور کثرت کی ایک اچھوتی تعبیر علامہ اقبال نے اس طرح کی ہے:

اسرار ازل جوئی بر خود نظرے واکن — یکتائی و بسیاری، پنہانی و پیدائی

علامہ اقبال پرانے وحدت الوجودی کی طرح انسان کو مجبور، معذور، مقہور اور مغلوب دیکھنا
پسند نہیں کرتے، خود خدا کی نظر میں یزداں صفات آدم کے مقام اور احترام کے خواہاں ہوتے
ہیں، وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ متناہی خودی لامتناہی خودی میں جذب ہو کر اپنی ہستی فنا کردے
بلکہ یہ کہ لامتناہی، متناہی کی آغوش محبت میں آجائے، بعض مسلم مفکرین کی وجہ سے وحدت الوجود
کا مسئلہ جامد، غیر موثر اور غیر متحرک بن گیا تھا، اقبال نے اس کو فعال، موثر اور متحرک
بنا دیا ہے، ان کی وحدت الوجود میں نوفلاطونیت، یونانیت، اشراقیت، عجمیت اور
فلسفہ ویدانت کی ہندویت نہیں، بلکہ اسلامی وحدت الوجود کا ایک تجدیدی رنگ
ہے، جس میں شریعت اور اسلامی نظام فکر کے ساتھ فطرت کی خابندی ہے اور انسان کے
خاکی جسم میں انداز افلاکی اور آداب خداوندی ہے، جس طرح اب یہ اچھی طرح واضح ہوتا
جا رہا ہے کہ اقبال اسلامی تصوف کے نہیں بلکہ بگڑے ہوئے ہوئے تصوف کے مخالف
رہے، اسی طرح جتنا گہرا مطالعہ کیا جائے گا، اتنا ہی یہ اندازہ ہوگا کہ اقبال بگڑی ہوئی
وحدت الوجود بلکہ نوفلاطونی، یونانی، اشراقی، عجمی، ویدانتی اور غیر شرعی وحدت الوجود
کے مخالف تھے، لیکن اسلامی وحدت الوجود کے حامی رہے اور ان کو ہونا بھی چاہئے تھا،

ورنہ وہ اپنے پیر روم کے معنوی مرید صحیح طور پر نہ ہو سکتے تھے، بعض حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ اقبال وحدت الوجود کے مقابلہ میں وحدت شہود سے متفق ہیں، جس کے علم بردار حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ ہیں، اگر حضرت مجدد الف ثانی کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ وہ بنیادی طور پر وحدت الوجود کے منکر نہیں، اس کی غلط تعبیر کو غلط سمجھتے ہیں، وہ وحدت الوجود کے مسئلہ سے نہیں، بلکہ اس کے ان مدارج سے اختلاف کرتے ہیں، جن میں شریعت کا دامن چھوٹ جانے کا احتمال یا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے علماء کو تو یہ سمجھایا کہ اگر وحدت الوجود کی تشریح صحیح طور پر کی جائے تو یہ گمراہی نہیں، اور صوفیہ کو سمجھایا کہ اگر علوم لدنیہ کی مطابقت علوم شرعیہ سے نہیں ہے تو ایسے تمام علوم کا حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے، شاہ ولی اللہؒ نے بھی وجود و شہود پر بڑی اچھی بحث کی ہے، ان کا خیال ہے کہ شیخ محی الدین اکبر کی وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانی کی وحدت الشہود ایک ہی شے کے دو نام ہیں، وجود و شہود محض نزاع لفظی ہے۔ ان میں مطابقت ہے، مخالفت نہیں، علامہ اقبال کے متعلق جب یہ کہا جائے کہ وہ وحدت الوجود کے بجائے وحدت الشہود سے متفق تھے، تو شاہ ولی اللہؒ کی اس رائے کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے، علامہ اقبال کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ وحدت الوجود کے منکر نہیں، بلکہ اس کی غلط تعبیر کو غلط سمجھتے تھے، تو کیا یہ صحیح نہ ہوگا

اقبال جن سے متاثر ہوئے ان میں عراقی اور سنائی بھی تھے، انھوں نے عراقی کے تصور زمان و مکان سے استفادہ کیا، اس پر مولانا امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون زیرنظر اقبال نمبر میں ہے، جناب بشیر احمد ڈار صاحب، اقبالیات کے بہت بڑے ماہر ہیں، انھوں نے بڑے فاضلانہ بلکہ والہانہ انداز میں ثابت کیا ہے کہ اقبال سنائی کے کن کن خیالات سے

متاثر ہوئے، اسی سلسلہ کے بعض مضامین میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اقبال غالب اور حافظ سے بھی متاثر ہوئے، مگر نقوش کے اس نمبر کا یہ حصہ تشنہ اس لحاظ سے ہے کہ کچھ مضامین ایسے بھی ہونے چاہئے تھے، جن میں یہ دکھایا جاتا کہ اقبال نے قرآن سے خودی کی تعلیم کیسے حاصل کی، عشق رسول کے ذریعہ ان کی خودی کی نشو و نما کیسے ہوئی، وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عشق و محبت کی استواری اور رازداری سے کیسے سرشار رہے، ان کو خاصۂ خاصان عشق اور ان کے عشق کو سر مطلع دیوان عشق کیوں کہا؟ حضرت عمرؓ کے دل بیدار، فقر اور سلطانی میں کیا کیا جلوے دیکھے؟ حضرت علیؓ کے ایمان میں ان کو عشق کا سرمایہ کیسے ملا؟ حضرت بلالؓ کی نوائے جگر گداز میں ان کو نور نبوت کیسے نظر آیا؟ رسم سلمان، گلیم بوذرؓ اور دلق اویس میں ان کو کیا کیا چیزیں ملیں؟ پیر روم کے ذریعہ سے ان پر راز زندگی اور سر مرگ کیسے فاش ہوا؟ ان کے یہاں عبدالکریم جیلیؒ کے خیالات پائے جاتے ہیں کہ نہیں؟ انھوں نے حضرت فضیلؒ اور حضرت ابوسعیدؒ سے پاک مردانگی کا درس کیسے حاصل کیا؟ حضرت جنیدؒ اور بایزید بسطامیؒ کے جمال کو بے نقاب کیسے دیکھا؟ منصور کے عرفان کی تجلیوں میں عین فطرت کی تجلی کیسے دیکھی؟ حضرت سید احمد رفاعی کے ضمیر کے نور کو کسب کرنے کی فکر کیسے کی؟ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دل بے تاب اور درون ناشکیبائی میں کیفیت کس کس طرح محسوس کی؟ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے لحد کی زیارت میں دل کی زندگی کیسے پائی؟ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ذریعہ ان کو شعور ولایت اور شعور نبوت کا فرق کیسے معلوم ہوا؟ حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے مزار کی خاک کو زیر فلک مطلع انوار کیوں قرار دیا؟ نگاہ غزالیؒ کی طرف ان کی نظر کیوں اٹھی، بو علی سینا کے مقام فکر تک کیوں پہونچنے کی کوشش کی؟ حیرت فارابی سے کیوں متحیر رہے؟ نظریۂ نور سے متعلق ان کے خیال کو ابن رشد سے کیسے تقویت پہونچی؟ ابو الدولہ سخانیؒ اور جنید بغدادیؒ کے خیالات کو اپنے اشعار میں کیوں منتقل کیا؟ ابن تیمیہؒ

ابن خلدون، البیرونی اور ابن حزم کے کن خیالات سے متاثر ہوئے؟ جمال الدین افغانی اور سرسید کے افکار کا اثر ان پر کہاں تک ہوا، سخن گوئی میں فرید الدین عطار کی غلامی کیوں کی؟ عراقی کے اشعار سے کیوں لذت آشنا ہوئے؟ بوعلی قلندر پانی پتیؒ میں گل رعنا کی دلآویزی کیوں پائی؟ اللہ تعالیٰ سے امیر خسروؒ کے سینے کے آتشدان کے سوز کے کیوں طلب گار ہوئے؟ اپنے کو کشتۂ جامی کیوں قرار دیا؟ عرفی کی غیرت اور تخیل اور فیضی کی توانائی اور جوش کو کیوں اپنانے کی کوشش کی، غنی کشمیری کی نواسنجی، غالب کی روح اور میر کا درد اپنے میں کیوں سمونے کی کوشش کی؟ پھر طارق بن زیاد، عبد الرحمن اول، سلیم، سنجر، طغرل، محمود غزنوی، مراد، بابرؒ، شیر شاہ سوری، عالمگیر اور ٹیپو سلطان ان کے شاعرانہ ذہن پر کیوں چھائے رہے؟

اقبال کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہ موضوعات ایسے ہیں جن پر سیر حاصل مضامین لکھنے کی ضرورت ہے، اب تک بہت کچھ اس پر لکھا گیا ہے کہ وہ برگسان، گوئٹے، نطشے، شوپنہار، وائٹ ہیڈ وغیرہ، اور ملٹن وغیرہ جیسے یورپی فلسفیوں اور شاعروں کی رتھ پر سوار ہو کر اپنے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کرتے رہے، مگر اقبال کو ان فلسفیوں اور شاعروں کی گاڑی کا قلی قرار دینا ان کی عظمت و جلالت اور اسی کے ساتھ اسلامی غیرت و حمیت پر ضرب کاری لگانا ہے۔

نقوش کے زیر نظر نمبر میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے جو یہ لکھا ہے کہ:

"اقبال کے نظام فکر کو مرتب کرتے وقت سب سے پہلے اس امر کو ملحوظ رکھنا لازمی ہوگا کہ ان کی فکر قرآنی تعلیمات اور اسلامی شعار اور اقدار کے ماتحت تشکیل پائی ہے، اور اگرچہ انھوں نے مغربی فلسفہ اور جدید سائنس کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے، لیکن ان سب کو اسلام کے بنیادی اصول پر پرکھنے اور ان اصول سے مطابق یا مخالف ہونے کی بنا پر انھیں قبول یا مسترد کر دیا ہے، بلکہ اس معاملہ میں وہ مسلم متکلمین کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھتے ہیں کہ ان متکلمین کے خیالات جہاں کہیں قرآنی تعلیمات کے منافی ہوں، انھیں بھی مسترد کر دیتے ہیں۔"

یہ میرے استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کی آواز بازگشت ہے، انھوں نے علامہ محمد اقبال کی وفات کے موقع پر لکھا تھا کہ وہ حکیم تھے، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں، یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار کلام الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتے، بادۂ انگور کو نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتے تھے، اقبال کے متعلق دار المصنفین کا یہی مکتب فکر ہے، اور یہاں کے ارباب قلم نے برابر یہی دکھایا ہے کہ اقبال نے اپنے عقائد کی بنیاد تمام تر قرآن مجید پر رکھی، اور انھوں نے اپنی شاعری سے عصائے موسیٰ اور ید بیضا دونوں کا کام لیا اور مغربی تہذیب اور جدید افکار کی جڑ پر تیشہ چلایا، اس کے ایک ایک عیب کو بے نقاب کیا، اسلام کو بڑے حکیمانہ انداز میں پیش کیا (اقبال کامل ص ۶۱ و معارف اکتوبر ۱۹۷۱ء)

اقبال کو دکھ تھا کہ:

گنوا دی ہم نے، جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اقبال نے اپنے اسلاف کی میراث ہی کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کی ہے، تاکہ نہ صرف ہم کو بلکہ گرتی ہوئی انسانیت کو زمین پر سے اٹھا کر ثریا تک پہونچائیں، اسی میں ان کی اصلی عظمت ہے۔

نقوش کے زیر نظر اقبال نمبر میں ایک مضمون "اقبال اور رسالہ معارف" بھی ہے

معارف میں ۱۹۱۶ء سے اب تک اقبال پر جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں، اگر ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں ہو جائیں، مضمون نگار معارف کے ان پورے مضامین کا احاطہ نہ کر سکے ہیں، اس کے ابتدائی دور کے صرف مضامین کا ذکر آیا ہے، زیر نظر نمبر میں پروفیسر طاہر تونسوی کا ایک مضمون "اقبال اور سید سلیمان ندوی" بھی ہے، اب اس میں مزید اضافہ کرکے انھوں نے اس کو ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے، لاہور کے قیام میں مجھ سے اس پر ایک تحریر بھی لکھائی تھی، خدا کرے یہ کتاب علمی حلقہ میں شوق سے پڑھی جائے

(باقی)

حیات سلیمان

یہ محض سید صاحب علیہ الرحمہ کی سادہ سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ ان کے دور کی پوری علمی تاریخ ہے، جس میں اس دور کی تمام ملی و قومی، سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامہ مسجد کانپور، تحریک خلافت، ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز کی پوری تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین کی تاسیس اور عہد بہ عہد ترقی کی روداد کے ساتھ ترک دارالمصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان اور وہاں کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی، ملی و دینی خدمات انجام دی ہیں، ان سب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، یہ اسلوب تحریر اور طرز انشا کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا ثنی ہے، ویسے ہی دلکش، دلچسپ اور پر از معلومات۔

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت ۲۷ روپیہ ۵۰ پیسے

وفیات

آہ ماہر القادری!

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جناب ماہر القادری کی وفات کی خبر سے بہت ہی دل گیر اور دل فگار ہو کر جب یہ تحریر لکھنے بیٹھا ہوں تو کراچی کی ساری علمی و ادبی مجلسیں یاد آرہی ہیں،

کراچی بار بار جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کی ممتاز علمی شخصیتوں کی یادوں کی قندیلیں روشن کرتا رہتا ہوں، ان میں بہت سے اللہ کو پیارے بھی ہوگئے، اختر جونا گڈھی مرحوم یاد آتے ہیں ان کی کتاب طبقات الامم دارالمصنفین سے شائع ہوئی تھی، معارف میں مولانا شبلیؒ پر اچھے مضامین لکھے، وہ بزرگ محترم مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم کے ساتھ جوناگڈھ سے شہاب رسالہ بھی نکالا کرتے تھے، دارالمصنفین کے بڑے قدر دان رہے، وہ جس محبت سے کراچی میں ملے اس کی یاد برابر باقی رہے گی، ان ہی کے یہاں کھانے پر حفیظ ہوشیارپوری مرحوم سے ملا تھا، ان کے پرکیف نغمۂ شعری سے بھی محظوظ ہوا تھا، ان کی محبت بھری باتوں میں بڑی کیفیت تھی، ممتاز حسن مرحوم (ریٹائرڈ سکریٹری محکمۂ فنانس حکومت پاکستان) یاد آتے ہیں تو ان کی علم نوازی، گرم گستری اور دوست پروری کے معطر اور نکہت بیز پھولوں کے بارے سے دبتا چلا جاتا ہوں، ایک رات جناب جمیل عالی کے دسترخوان پر میں جناب ممتاز حسن مرحوم، ابن انشاء مرحوم، اور یادش بخیر پیر حسام الدین راشدی کے ساتھ شریک ہوا، رات کو ایک بجے تک علمی و ادبی باتیں ہوتی رہیں، وہ

رات بھی کیسی حسین اور بہار آفریں تھی، ممتاز حسن مرحوم ایک تناور سایہ دار علمی برگد تھے، اسی کے چھاؤں کے نیچے کراچی کے ارباب علم جمع ہوتے اور اُن کے سایۂ عاطفت میں اپنے علمی و ادبی ذوق کو پھلتے پھولتے محسوس کرتے، جناب ابن انشا مجلسوں میں قینی اور خاموش بنے رہتے، مگر اخبار کے کالم میں شب برات کی پھلجڑی اور پٹاخے بن جاتے انکی موت پر پاکستان کے اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر جو ماتم ہوا ہے، وہ قابل رشک ہے، جمیل عالی صاحب ابھی بقید حیات ہیں، خدا کرے ابھی بہت دنوں زندہ رہیں، اخبار کے کالم اور ٹیلی ویژن کے تو وہ ہیرو سمجھے جاتے ہیں جناب پیر حسام الدین راشدی تو کراچی کے نہ صرف پرنس اسکالر ہیں، بلکہ وہاں کے علمی معشوقوں کے معشوق ہیں، ان کی کوٹھی تو میرے لیے ایک علمی زیارت گاہ بن گئی ہے، ان کو نوشت و خواند کے کمرے میں پہونچ جاتا ہوں تو وہاں علم و فن کی کرنیں میرے ذہن کو گرماتی رہتی ہیں، وہ اپنے یہاں کراچی کے اہل علم کو برابر مدعو کر کے ان سے ملاقاتیں کراتے رہتے ہیں، ان ہی کے یہاں پہلی دفعہ فلسفہ اور فلسفۂ اقبالیات کے بہت بڑے ماہر

جناب بشیر احمد ڈار صاحب سے ملا ان کے عجز، انکسار اور استغناء سے ان کا علم و فن دب کر رہ گیا ہے، اقبال پر ان کا جب کوئی مضمون پڑھتا ہوں تو نظر و فکر میں کندن سی چمک پیدا ہو جاتی ہے، راشدی صاحب ہی کے دولت کدہ پر پروفیسر شیخ عبدالرشید سے بارہا ملا، بوڑھے ہیں مگر علمی باتوں میں جوان رعنا نظر آتے ہیں، تاریخ کے ہر پہلو پر ناقدانہ نظر رکھتے ہیں، راشدی صاحب ہی کے یہاں ڈاکٹر ریاض الاسلام صدر شعبۂ تاریخ کراچی یونیورسٹی سے کئی بار ملا، خاموش، متین اور سنجیدہ ہیں، مگر کام کرنے کی لگن کی وجہ سے کسی نہ کسی علمی کام میں لگے رہتے ہیں، اور اب تک بہت سی کتابوں کے مصنف

ہو چکے ہیں، کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کو اردو کے ایک مصنف اور نقاد کی حیثیت سے تو جانتا تھا، مگر جب ان کی کتاب اقبال اور مسئلہ تصوف پڑھی تو ان کو علم معرفت کا اداشناس بھی سمجھنے پر مجبور ہوا، اور جب ان کی یہ کتاب ختم کی تو محسوس ہوا، کہ بہت دنوں کے بعد ایک اچھی کتاب پڑھنے کو ملی، یہ کتاب جناب ڈاکٹر معز الدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی کے ذریعہ سے ملی جس کے لئے ان کا شکر گذار ہوں، ڈاکٹر معز الدین صاحب کراچی میں تھے، تو اس طرح ملے جیسے کوئی شفیق چھوٹا بھائی ملتا ہو، ان کی بھلمنساہت بڑی دل آویزی ہے، جناب شریف المجاہد جرنلزم کے فن کے استاد ہیں ان کا مضمون جہاں کہیں دیکھتا ہوں ضرور پڑھتا ہوں،

جناب مشفق خواجہ ..... تو اردو ادب کے حبیب بن کر اب اس کے محبوب بن گئے ہیں، ہر مجلس میں ان کی شان محبوبیت قائم رہتی ہے، وہ میری دل نوازی جس طرح کرتے ہیں، اس کی روداد کم دل آویز نہیں،

کراچی کے علمی حلقہ میں جناب حکیم محمد سعید دہلوی سے بھی بارہا ملنے کا اتفاق ہوا خوش ذوقی جامہ زیبی اور مہمان نوازی کے پیکر ہیں، ان کی علم نوازی میں وہی شان پائی جاتی ہے جو تیموری دربار کے امراء کے یہاں ہوا کرتی تھی، معلوم نہیں کیسی کیسی علمی مجلسیں منعقد کیا کرتے ہیں، اور کس کس طرح سے ارباب علم کو اپنی فیاضیوں سے سیراب کرتے رہتے ہیں

کراچی کی علمی مجلسوں میں مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی تو بلبل ہزار داستان ہیں کہیں بیٹھ جائیں تو وہی چھائے رہتے ہیں، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ اسلام یہود و نصاریٰ کے صحائف، افریقہ کے جنگلی قبائل، تبلیغ اسلام روڈیشیا کے آئین اسمتھ، انگریز مورخ ٹوائن بی، ہٹلر، مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، پاکستان تحریک، شدھی، سنگھٹن،

شعر و ادب، امیر مینائی، جوش ملیح آبادی، سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، غزل، دوہے، گھی گیت اور برجستہ ایک سانس میں گفتگو کر کے سامعین کو ساکت وصامت بنا دیتے ہیں، وہ اپنی معلومات کے لحاظ سے انسائیکلو پیڈیا ہیں، مولانا ناظم ندوی سابق شیخ الجامعہ مدرسہ بہاولپور کو عربی شعر و ادب میں بڑا عبور رہے، عربی کے اشعار برجستہ سناتے ہیں، اور خود بھی کہتے ہیں، عربی میں ان کی گہری نظر کا معترف کراچی کا پورا علمی حلقہ ہے، مہمان نوازی، اور دوستوں کی دلجوئی، کا پورا حق ادا کرتے ہیں، مولانا حسن مثنیٰ ندوی، پاکستان، کے موتمر اسلامی کے صدر ہیں، بہت اچھے مقرر ہیں، اپنے اردگرد دوستوں اور نوجوانوں کو ساتھ رکھنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں، نوجوانوں میں کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کا بھی خاص سلیقہ رکھتے ہیں، قمر نیمروز کے اڈیٹر ہیں اپنے قہقہوں اور چٹکلوں سے مجلس کو گرم رکھتے ہیں، ان کے ہمدم اور دمساز ظفیر الحسن صاحب ہیں جو بیدل لائبریری کے جنرل سکریٹری ہیں، ان میں علمی سرگرمیوں کو جاری رکھنے اور رکھانے کی بڑی لگن ہے، کسی نہ کسی مفید کام میں لگے رہتے ہیں، ڈاکٹر مطیع الاسلام صدر شعبہ فارسی کراچی یونیورسٹی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کی تصانیف پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں مجھ سے بزم صوفیہ کے مصنف کی حیثیت سے جس اخلاص سے ملتے ہیں، اس کے لئے ان کا شکر گذار ہوں، جناب شفیق بریلوی نے ارمغان لغت مرتب کر کے کراچی کے علمی حلقہ میں بڑی مقبولیت حاصل کرلی ہے، بڑے متحرک اور فعال قسم کے اہل علم ہیں، یزنی انصاری صاحب سے ملنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے جسم کے کسی حصہ کو چھو لیجئے تو علم ہی کی آواز بلند ہوگی، انگریزی میں، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مستقل مقالہ نگار ہیں، اس کے بورڈ آف ڈائرکٹر کے بھی شاید رکن ہیں، شاہجہانی دور کے علامی سعد اللہ خان پر ایک کتاب بڑی محنت

اور عرق ریزی سے لکھی ہے، پروفیسر ایوب قادری تو ان گنت کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، عہد مغلیہ کے دور کی فارسی کتابوں کا اردو ترجمہ کرنے میں غیر معمولی ملکہ حاصل کر لیا ہے، کراچی یونیورسٹی میں اس کے وائس چانسلر جناب احسان رشید صاحب سے ملا تو ان کی قد آور شخصیت اور تواضع سے متاثر ہوا، وہیں شعبۂ اردو کے پروفیسر ابوالخیر کشفی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے جس طرح پذیرائی کی اس سے ان کا ممنون ہوا،

ڈاکٹر معین الحق جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی مورخانہ بصیرت کی وجہ سے ان کی ذات خود ایک علمی انجمن بنی ہوئی ہے، ان کی ملاقات درس وتدریس کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

جناب خالد اسحٰق کراچی کے بہت ہی مقبول اور مشغول ایڈوکیٹ ہیں، ایک روز انھوں نے اپنے یہاں برادرم ڈاکٹر سلمان ندوی کے ساتھ کھانے پر مدعو کیا تو ان کا کتب خانہ دیکھ کر خوش ہوا، ان کا علمی ذوق پورے شہر میں مشہور ہے، بڑے دیدہ ور سیاست داں اور ایڈوکیٹ سمجھے جاتے ہیں، بڑی شستہ گفتگو کرتے ہیں، اردو، پنجابی، سندھی اور انگریزی ایک ساتھ بولتے ہیں، دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے درد رکھتے ہیں، ان ہی کے یہاں جناب صلاح الدین اڈیٹر تجارت سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بنیادی حقوق کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس کی دھوم پورے پاکستان میں ہے، ان کی اس کتاب کی رونمائی کے موقع پر انگریزی زبان کے لائق مصنف جناب جمیل احمد صاحب سے ملاقات ہوئی جنھوں نے Hundred Great muslims of the world لکھی ہے، یہ پورے پاکستان بلکہ بیرون پاکستان میں بہت ہی شوق سے پڑھی جارہی ہے، اس کا ایک نسخہ مجھ کو بھی

عنایت کیا، بہت ہی خاموش قسم کے اہل قلم معلوم ہوئے،

ماہر القادری مرحوم کی ماتمی تحریر کے سلسلہ میں یہ ساری باتیں بظاہر بے جوڑ معلوم ہونگی، لیکن اس لمبی تمہید کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کراچی کے علمی حلقہ کی بہت سی ممتاز شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر ان میں سب سے رعنا، دل آویز اور باغ وبہار شخصیت مولانا ماہر القادری کو پایا، جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے، دن ہو تو مجلس کے گل سرسبد بن گئے، رات ہے تو شمع محفل نظر آئے۔

ان سے غائبانہ تعارف ۱۹۳۵ء سے بھی پہلے کا تھا، انھوں نے اپنی ایک غزل ایک بار معارف میں چھپنے کے لیے بھیجی، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کا ذوق شعری بہت عمدہ تھا، اس میں انھوں نے کچھ اصلاح دیدی، ماہر القادری صاحب نے اسکو پسند نہیں کیا، خفا خفا ایک خط حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کو لکھا، اس کا جواب سید صاحبؒ نے بہت ہی نرم اور ٹھنڈے انداز میں دیا جس سے وہ بہت متاثر ہوئے اس کا ذکر کراچی کی علمی مجلس میں برابر کرتے، جب میں ۱۹۷۵ء میں پاکستان گیا تو مولانا ظفر احمد انصاری صاحب سے بزرگانہ وعزیزانہ مراسم پیدا ہوئے انھوں نے مجھکو اپنے یہاں مدعو کیا تو جناب ماہر القادری کو مجھ سے ملنے کے لیے خاص طور پر بلایا، وہ ان کو اس قدر پسند کرتے کہ اپنے یہاں چھوٹی بڑی جو بھی دعوت کرتے تو ان کو ضرور بلاتے، خود ماہر القادری صاحب ان کے بڑے دلدادہ تھے یہ دلدادگی بلا وجہ بھی نہ تھی، مولانا ظفر احمد انصاری کراچی میں اپنے قدردانوں، دوستوں اور مخلصوں کے پیر مغان ہیں، وہ سند یافتہ عالم تو نہیں ہیں، بلکہ الہ آباد یونیورسٹی سے ام۔ اے۔ کیا اور یونیورسٹی میں اول آئے، ال۔ ال۔ بی کے امتحان میں بھی

امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی، شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتے ہیں، ان کی ایک قومی نظم کی بھی شہرت ہوئی تھی، مگر وہ پاکستان کی تحریک میں شریک ہوئے تو پھر سیاست ہی کے ہو کر رہ گئے، مسلم لیگ کی کمیٹی آف ایکشن اور ...... آل انڈیا مسلم لیگ سنٹرل پارلیمنٹ بورڈ کے سکریٹری پھر آل انڈیا مسلم لیگ کو اسسٹنٹ سکریٹری بھی رہے، جناب لیاقت علی خان مرحوم کے ساتھ بھی کام کیا، ان ہی کی مساعی جمیلہ سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مسلم لیگ میں شامل ہوئے، پاکستان کی دستور سازی کے سلسلہ میں جو تعلیمات اسلامی کا بورڈ بنا، اس کے بھی سکریٹری رہے، اور جب استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ پاکستان پہونچے تو ان کے ساتھ بھی کام کیا، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دلانے میں ان کا نمایاں ترین حصہ رہا جب میں ان سے ملا تو وہ پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے بڑے با اثر آزاد رکن تھے حکومت اور حزب مخالف دونوں ان کی رائے کی قدر کرتے، وہ اپنی نرم، شیریں سبک، متوازن اور متین باتوں سے اپنے ملنے والوں کے دلوں کی تسخیر کرتے ہیں شہرت یا کوئی ذاتی فائدہ نہیں چاہتے، گمنام رہ کر پاکستان کے تعمیری کاموں میں لگے رہتے ہیں، اس لیے پاکستان کے گمنام معمار کہلاتے ہیں، عربی کا ایک مدرسہ بھی ان کی نگرانی میں چل رہا ہے پاکستان کے سربراہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق انکی بے لوثی بے غرضی، رائے کی اصابت کے معترف ہیں ان کی ذات گرامی میں کچھ ایسی ہی مقناطیسیت ہے، دار المصنفین کی مطبوعات کے حق طباعت و اشاعت کا جو معاہدہ نیشنل بک فونڈیشن کراچی سے ہوا اس سلسلہ میں ہر قسم کی مدد ہوسکی ان کے یہاں ادیب، شاعر، عالم، وکیل، سیاست داں سب ہی جمع ہوتے ہیں، جناب

ماہر القادری تو ان کے قلب کی دھڑکن بن کر رہے، ان کے یہاں ماہر صاحب سے جو ملاقات ہوئی، تو یہ مشفقانہ راہ و رسم میں تبدیل ہو گئی، پھر خدا جانے کتنی ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ میری قیام گاہ پر آتے، اور میں ان کے گھر پر حاضر ہوتا، دعوتوں اور جلسوں میں ان کا ساتھ رہتا، علامہ محمد اقبال کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا، ان دنوں وہ لاہور ہی میں تھے، کافی رات گذر چکی تھی تو وہاں ملنے آئے، اور دیر تک اپنی باتوں سے محظوظ کرتے رہے،

ان کی شیوہ بیانی ان کی خاص چیز تھی، اس وقت ان کی طلاقت لسانی زیادہ بروئے کار آتی جب وہ اختلافی مسائل پر گفتگو کرتے، تصوف، وحدت الوجود، بدعت، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، بریلوی طائفہ، زبان، ادب، تذکیر و تانیث ان کا خاص موضوع ہوتا، تصوف کے مخالف اور وحدت الوجود کے منکر تھے، ان دونوں مسائل پر گفتگو کرتے وقت پسینہ میں تر ہو جاتے، ان کو چھیڑنے کے لیے ان کے دلائل کا رد کیا جاتا تو پھر ان کی قوت گویائی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا، کلام پاک اور حدیث کا سہارا لے کر اپنے معترض کو قائل کرنے کی کوشش کرتے، کلام پاک کی آیتیں پڑھتے اور حدیث کے حوالے دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ہم کو کوئی مستند عالم مخاطب کر رہا ہے، حالانکہ انھوں نے فارسی اور عربی کی تعلیم گھر ہی پر پائی تھی، انگریزی تعلیم شاید میٹرک ہی تک حاصل کی تھی، مگر بحث کرتے وقت اپنی مذہبی اور علمی معلومات میں جدید عالموں اور انگریزی دانوں سے کسی حال میں دبتے نظر نہیں آتے، ان کو معلوم تھا کہ یہ راقم بزم صوفیہ کا مصنف ہے، تصوف اور وحدت الوجود کے خلاف لڑتے وقت میرا ہاتھ پکڑ لیتے اور میری دل جوئی کی خاطر کہتے کہ میں تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کا مخالف

نہیں ہوں، مگر تصوف میں جو غیر اسلامی اور راہبانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے، اس کا مخالف ہوں وہ میری کسی بات سے قائل ہونا پسند نہیں کرتے، جب بحث کرنے میں ان کو پسینہ آنے لگتا تو موضوع کا رخ بدل دینے کی کوشش کی جاتی، ایسے ہی ایک موقع پر جب ان کی بحث میں بہت تیزی آرہی تھی تو ایک صاحب بول اٹھے کہ مولانا شبلیؒ شان نزول کو مذکر لکھتے ہیں، شان تو مونث ہے، شان نزول بھی مونث ہونا چاہئے، پھر ان کا رنگ ہی بدل گیا، بولے کہ مولانا شبلیؒ نے شان نزول کو مذکر لکھا ہے تو یہی صحیح ہے، ان کے یہاں زبان کی کوئی غلطی نہیں مل سکتی، وہ مولانا شبلیؒ کے بڑے عقیدت مند تھے، بارہا ان کی زبان سے سنا کہ مولانا شبلیؒ ایک طرف اور ساری علمی و ادبی امت دوسری طرف ہو تو بھی ان کا پلہ بھاری ہوگا، ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، ماہر صاحب اردو زبان کے محاوروں، تذکیر و تانیث اور واحد و جمع پر بڑی اچھی نظر رکھتے تھے، کہتے کہ درد اگر جمع کے ساتھ استعمال ہو تو معنے بدل جاتے ہیں، درد اٹھ رہے ہیں سے مراد دردِ زہ ہوتا ہے، ستو کے ساتھ پینا ہمیشہ جمع کے ساتھ استعمال ہونا چاہئے ستو پیجئے صحیح ہے، ستو پیا ہوا لونا غلط ہے، کہنے لگے کہ جوش ملیح آبادی نے ایک جگہ رنگینی پھٹ پڑی کا محاورہ استعمال کیا ہے، شباب اور جوانی کے لئے پھٹ پڑنا استعمال ہوتا ہے، رنگینی پھٹ پڑنا غلط ہے، کہتے کہ ہر زبان کا مرکز ہوا کرتا ہے، حجاز عربی اور ایران فارسی کا مرکز ہے، تو اردو کا مرکز لکھنؤ اور دہلی کو تسلیم کرنا پڑیگا، وہیں کے روزمرے اور محاورے مستند سمجھے جائیں گے، اسی کے ساتھ اقبال کے بہت معترف تھے، کہتے کہ میر کی شاعری آہ ہے، سودا کی واہ ہے، تو اقبال کی شمع راہ ہے، رومی نے مسلمان کو ولی اللہ بنانے کی کوشش کی تو اقبال نے کافر کو مسلمان بنایا، اقبال کی وفات پر انھوں نے ایک غمناک نظم بھی لکھی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں،

کاروان خواب میں تھا بانگ درا سے پہلے
ساز میں سوز نہ تھا تیری نوا سے پہلے

اللہ اللہ ترا قافلۂ نطق و کلام
بال جبریل کے سایہ میں ہوا گرم خرام

صرف مشرق نہیں مغرب کو بھی پیغام دیئے
نگہ و فکر پہ اسرار خودی فاش کئے

تو کبھی شعلۂ رقصاں، کبھی رفتار نسیم
موج کوثر ترے اشعار کہیں ضرب کلیم

ایک نئی طرز نئے باب کا آغاز کیا
شکوہ اللہ تعالے سے بصد ناز کیا

ترے شعروں میں کہیں معرکۂ بدر و حنین
کہیں ایمان براہیم کہیں عزم حسینؓ

اس لئے ہے تری ایک ایک مجھے بات قبول
ترا سرمایۂ دانش تھا فقط عشق رسول

محفل رومی و عطار تھی مدت سے خموش
ترے نغموں نے بنایا اسے ہنگامۂ جوش

علم و حکمت کے مسائل کو دیا شعر کا رنگ
کس نزاکت سے ہم آغوش کئے شیشہ و سنگ

فکر افسردہ کو پرواز عطا کی تو نے
لب خاموش کو آواز عطا کی تو نے

اس جامع نظم میں اقبال کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، مگر جب ان سے کہا جاتا کہ رومی اور اقبال دونوں تصوف اور وحدت الوجود کے قائل تھے، تو پھر ان کی بحث میں تیزی آجاتی، لیکن انکی بڑی خوبی یہ تھی کہ تلخ بحث کرنے میں کتنے ہی منہمک ہوجاتے، رخ بدل جاتا تو یکایک وہ بذلہ سنج، لطیفہ گو اور قہقہوں اور چہچہوں کے مالک بلا شرکت غیرے ہو جاتے، اس برصغیر کا کوئی سیاسی، علمی، ادبی اور معاشرتی لطیفہ ایسا نہ تھا، جو ان کے ذہن کے خزینہ میں محفوظ نہ تھا، اگر کوئی کسی اچھے لطیفہ کو صحیح طور پر بیان نہ کرتا تو وہ بد حظ ہو کر اس کی اصلاح کرتے، اپنے لطیفوں اور چٹکلوں سے مجلس کو زعفران بنائے رکھتے، کہتے کہ وہ نیند کے بادشاہ ہیں، نیند ہر وقت میری آنکھوں میں دھری رہتی ہے ریل کے مسافروں کے ہجوم میں بیٹھے بیٹھے سو یا ہوں اس طرح کہ دہلی سے ریل چلتے ہی

آنکھ لگی اور امرت سر پہونچ کر آنکھ کھلی، دنیا میں صرف ایک ہی شخص نیند میں ان سے بازی لے گیا، ایک بحری جہاز ڈوبنے لگا تو ایک شخص اس کے عرشہ سے سمندر میں گر گیا مگر سمندر کے پانی پر گرنے سے پہلے کچھ لمحات کے لئے وہ سو گیا، ان کی تفریحی باتوں کے درمیان ان سے ان کی غزلیں سننے اور سنانے کی فرمائش ہوتی تو پھر ان کی نعت، نظم، غزل اور گیت کے نغمے فضا میں اس طرح گونجنے لگتے کہ معلوم ہوتا کہ وہ پئے ہوئے ہیں اور پلا رہے ہیں، وقت گذرتا جاتا، ان کی زمزمہ سنجی اور گلفشانی جاری رہتی، وہ رخصت ہوتے تو جی چاہتا کہ وہ دوسرے دن پھر آتے، خود مجھ سے اور میں ان سے ملنے کے لیے بے قرار رہتا، کبھی چائے اور کبھی کھانے پر بلا لیتے، بریانی اور گاجر کے حلوے بہت شوق سے کھاتے، اور دوستوں کو کھانے کے لئے اصرار کرتے، کراچی میں ابھی گذشتہ فروری ہی میں اپنی قیام گاہ پر مولانا ظفر احمد انصاری، پیر حسام الدین راشدی، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، بزمی انصاری، مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی، مولانا ناظم ندوی، کاظم، ام اے، شفیق بریلوی، ڈاکٹر آفتاب صدیقی محمود الرحمن آہنگ، کے ایڈیٹر ٹینیسن اور جنگ کے نامہ نگار اقبال احمد صدیقی ظفر الحسن، ڈاکٹر محمد تقیم اور ڈاکٹر محمد طیب وغیرہ کو اپنے یہاں شام کی چائے پر مدعو کیا، ماہر القادری کی وجہ سے تو صبح صبح بنارس اور شام شام اودھ بن جاتی، وہ کیوں نہ ہوتے مجلس کو مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی اور جناب ماہر القادری دونوں نے مل کر لوٹا، یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دونوں میں کس کی شیوہ بیانی زیادہ کام کر رہی ہے، مگر جب حضرت ماہر القادری، اپنی نظمیں سنانے لگے تو پھر سب ہی لوگ دم بخود تھے، جنگ کے نامہ نگار نے کہا کہ یہ مجلس کراچی کی یادگار مجلس میں شمار کی جائے گی،

دار المصنفین کا معاملہ کراچی کے نیشنل بک فونڈیشن سے ہو رہا تھا، تو انھوں نے

ہر طرح کی اخلاقی مدد پہونچائی تھی، جس کے لئے ان کا شکر گذار رہا، کراچی سے اعظم گڈھ آتے وقت گذشتہ فروری میں ان سے رخصت ہوا، تو انھوں نے بھینچ بھینچ کر پیار کیا، کیا معلوم تھا کہ پھر کبھی ملاقات نہ ہوگی، ۱۰ رمئی کی رات کو پاکستان کی خبروں میں یکایک سنا کہ پاکستان کے مشہور ادیب، نقاد اور شاعر وفات پاگئے، ان کی تدفین مکہ معظمہ کی جنت المعلیٰ میں ہوگی،

یہ خبر سننے کے لئے تیار نہ تھا، غایت اضطراب میں رات کے زیادہ حصہ میں کروٹیں لیتا رہا، ان کا بشاش بشاش چہرہ، ان کی سرمگیں آنکھیں، ان کی دل آویز باتیں، ان کے لطیفے چٹکلے غزل اور نظم سنانے میں ان کی مترنم آواز کانوں میں گونجتی رہی، خیال آیا کہ مولانا شبلیؒ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ، دار المصنفین اور خود اس عاجز راقم کا ایک بڑا قدر دان جاتا رہا، استاذی المحترم نے کراچی پہونچ کر اسلامی ملکوں کے علماء کا ایک احتفال منعقد کیا تھا، اس کے انعقاد میں وہ بھی شریک تھے، اس موقع پر انھوں نے ایک نظم بھی کہی تھی، جس کے کچھ اشعار یہ ہیں،

یہ حقیقت آپ کو اچھی طرح معلوم ہے — آج دین حق جہاں میں ہر جگہ مظلوم ہے
دین سے بیزار دولت مند بھی نادار بھی — نفس کی خواہش کے بندے شیخ بھی خواجہ بھی
قوم کی وہ بیٹیاں جن کو بننا تھا بتول — مدرسوں میں سیکھتی ہیں ناچ گانے کے اصول
مال و زر جاہ و تعیش منزل مقصود ہے — آدمی کا اس جہاں میں آدمی معبود ہے
زندگی نان و شکم کے ماسوا کچھ بھی نہیں — دل میں سب کا خوف ہے خوف خدا کچھ بھی نہیں
ہر طرف باطل کے پھندے ہر طرف بازیگری — روس کا فتنہ بھی ہے اور لعنت افرنگ بھی
اپنی منزل سے ہیں اب تک ناشناس و بے خبر — مطمئن ہیں آج تک ہم کفر کے دستور پر

پھر اسی احتفال میں مصر، شام، عراق، الجزائر، افغانستان، برما اور انڈونیشیا کے

علمائے کرام کو للکار کر کہا تھا کہ

روک دو طاغوت کے طوفاں کو بڑھ کر روک دو

ان کی اس نظم کی تعریف سید صاحب نے بھی کی تھی، وہ معارف کے قدردان ہونے کی حیثیت سے اس کو پابندی سے پڑھتے، میرے قیام کراچی میں معارف جب ان کے پاس پہونچتا، ملنے کے ساتھ ہی اس کے مضامین کے معیار کی تعریف کرنے لگتے، کہتے کہ اس کا معیار اس کے ابتدائی دور سے اب بہت اونچا ہوتا جا رہا ہے، میرا جب کسی سے تعارف کراتے تو میری تمام تصانیف کا نام شمار کرنے لگتے، گذشتہ فروری میں اعظم گڈھ پہونچا تو ایک نعت معارف میں چھپنے کے لئے بھیجی جو معارف سے ان کے لگاؤ کا ثبوت تھا،

ان کے کوئی اولاد نہ تھی، غالباً اب سے چھ سات برس پہلے ان کی اہلیہ کی وفات ہوگئی تھی، اپنے چھوٹے بھائی سرور حسین کے بچوں کو اپنی اولاد سمجھتے رہے، ناظم آباد میں ایک اچھی کوٹھی خرید لی تھی، جس کی اب لاکھوں روپیے کی قیمت لگائی جاسکتی ہے، ان کی سجی سجائی کوٹھی سے ان کی خوش مذاقی اور خوش سلیقگی ظاہر ہوتی تھی، یہاں اپنے دوستوں کو برابر چائے اور کھانے پر بلایا کرتے، ان کے مدعوئین اختلافی مسائل پہ چھیڑ کر ان کے خیالات سن کر محظوظ ہوتے، انھوں نے کراچی پہونچ کر ۱۹۴۹ء میں رسالہ فاران نکالا، اس کی اشاعت تو بہت زیادہ نہ تھی، لیکن یہ اپنے مضامین کی سنجیدگی اور علمیت کی وجہ سے قدر کی نظر سے دیکھا جاتا، اس رسالہ کی وجہ سے ان کی عزت وقعت میں اضافہ ہوتا رہا، ان کے قدردان ان کے رسالہ میں کافی اشتہارات دیتے جس سے ان کو کبھی مالی پریشانی اٹھانی نہیں پڑی وہ مشاعروں اور علمی و ادبی مجلسوں میں ہر جگہ مدعو ہوتے، جس مشاعرہ میں وہ نہ ہوتے، وہ سونا رہتا، گذشتہ

مینہ جدہ ایک مشاعرہ میں گئے، جس میں حفیظ جالندھری بھی مدعو تھے، مشاعرہ سے پہلے مکہ معظمہ عمرہ کے لئے گئے، وہاں سے آئے تو مشاعرہ میں شرکت کی، ڈھائی بجے رات کو اپنا کلام سنایا، اور اس کے فوراً ہی بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، ان کی میت مکہ مکرمہ لے جائی گئی، جہاں بیت اللہ میں نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی، اور اسی سرزمین میں سپرد خاک کر دیے گئے، بڑے خوش قسمت تھے، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی محبت ان کی گھٹی میں پلائی گئی تھی، وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں،

خدا شاہد اور میری آشفتہ مزاجیاں اس کی گواہ ہیں کہ زندگی ہر طرح کے مرحلوں سے گزری، مگر کسی عالم میں بھی وہ مکہ اور مدینہ کی یاد سے خالی نہیں رہی" اسی یاد کی بدولت اپنی آرزوؤں کی جنت میں آخری آرام گاہ پائی،

ان کی زندگی کے مرحلے کی مختصر داستان یہ ہے: وہ کیسر کلاں ضلع بلند شہر یو۔پی میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد نے ان کا نام منظور حسین رکھا، مگر وہ اپنے تخلص ہی کی وجہ سے مشہور ہوئے، ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی سے میٹرک پاس ہوئے، ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد گئے، وہاں چودہ پندرہ برس رہ کر مختلف اوقات میں باب حکومت نظامت چشمہ شعبہ دی فوج، صدر محاسبی، ہائی کورٹ، دیوانی اور نظام فوجداری میں ملازم رہے، شاید وہیں مولانا عبد القدیر بدایونی سے بیعت ہوئے، مگر معلوم نہیں پھر کیوں تصوف سے بیزار ہو گئے، وہ حیدرآباد سے نجف اشرف، کربلا، بصرہ اور مداین کے سفر پر گئے، یہاں ان کو اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے مہاراجہ سر کشن پرشاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولوی عنایت اللہ، جوش ملیح آبادی، ہوش بلگرامی، نظم طباطبائی، ہادی رسوا، مسعود علی محوی، فانی بدایونی، نواب بہادر یار جنگ، نواب محمد خان

اور نواب نثار جنگ کی مجلسیں بھی ملتی رہیں،

حیدرآباد میں وہ اپنی نعتیہ نظم ظہور قدسی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے، ان کو مولانا شبلی سے بڑی عقیدت تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت پر جو نظم لکھی اسکا عنوان بھی یہی رکھا جو مولانا شبلی نے اپنی سیرۃ النبی میں رکھا تھا، بڑی لمبی نظم ہے، اس میں نوے ۹۰ اشعار ہوں گے، پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے جذبات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر مقدم کے ترانے گنگنانے میں بے قابو ہو رہے ہیں، اس کے احساسات کی مے عشرت چھلک رہی ہے، شادمانی کے پھولوں سے وہ لدا ہوا ہے، اس کی عقیدت کے موتی جھلملا رہے ہیں اس کے ہر شعر میں گل و لالہ کی رعنائی ہے، وہ نعت نہیں لکھ رہا ہے، بلکہ خوشی کا گیت گا رہا ہے، ولادت کا ذکر آتا ہے تو جوش طرب میں کہتے ہیں، شہ ہر دو سرا احمد مصطفےٰ غمگسار بے کساں، شفیع عاصیاں، نبی آخری، جہاں کی روشنی، مظہر شان احد، فاتح بدر و احد ہادی دین مبین، رحمۃ للعالمین، شہ کون مکان، وجہ تخلیق جہاں، رہبروں کے پیشوا، شمع بزم انبیا، دستگیر بے نوا، دردمندوں کی دوا، مخبر صادق لقب، سید والا نسب، چشمہ صدق و صفا، مہبط وحی خدا، عرش کے مسند نشیں، بزم خلوت کے مکیں، خاتم پیغمبران، امیر کارواں، زندگی کے مدعا، محبوب خدا، پیکر صبر و رضا، جد شاہ کربلا، قبلہ ارباب دین، صادق الوعد امیں، دافع رنج و الم، صاحب جود و کرم، رسول محتشم نبی محترم تشریف لائے، پھر سلام بھیجتے ہیں

ان کے عقیدت مندانہ جذبات کا سیلاب روکے نہیں رکتا، ہمارے رسول نے بیکسوں کی جو دستگیری کی، بادشاہی میں جو فقیری کی، اسرار محبت کو جس طرح سمجھا، یا زخم کھا کر دشمنوں پر جو پھول برسائے، اپنے خون کے پیاسوں ..... کو جو قبائیں دیں، گالیاں سن کر جو دعائیں دیں، سچائی کی خاطر جو تکلیف اٹھائی بھوکے رہ کر جس طرح اوروں کو کھلایا، جس کی سادگی میں

درس بصیرت ہے، جس کی ذات فخرِ آدمیت ہے، پھر اسی انداز میں مکین گنبد خضری شب معراج کے دولھا، شمع شبستانِ ازل، ابد کی بزم کے کنول، بہار گلشن عالم اور فخر مہین آدم پر درود بھی بھیجے ہیں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نعت کے لکھنے میں شاعر کے اندر [illegible] عقیدت کے جذبات کارفرما تھے، یہ نعت ایسی مقبول ہوئی کہ اس کو ایک علحدہ رسالہ میں شایع کیا گیا جس میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا تعارف ہے، اس میں وہ رقمطراز ہیں،

اس سلام میں ماہر نے حتی الوسع پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس قسم کے صفات منسوب کرنے سے احتراز کیا ہے، جن میں شان نبوت سے کوئی مناسبت نہیں ہے، لیکن عام شعرا حسن کے انتساب میں بے باک ہیں، یہ تو ان کا سلبی کارنامہ ہے، اس کے بعد انھوں نے سیرت طیبہ کی مستند کتابوں اور احادیث کے مفید ذخیروں سے ان سچے واقعات کا انتخاب کیا ہے، جن کی توثیق وتصدیق پر محدثین اور علماء سیر کی مہریں ثبت ہو چکی ہیں، پھر انہیں واقعات صادقہ کو اپنے خاص بلیغ اور اچھوتے انداز میں نظم کا لباس پہنایا ہے،

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ۔

ان کی شعریت کے متعلق اسی قدر عرض کر سکتا ہوں کہ وہ پڑھتے جاتے اور بے اختیار میرے دل سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ کر آنکھوں کی راہ سے نکل رہا تھا، اگر شعر کی بلندی پستی کا معیار اس کی تاثیری کیفیت ہے تو کم از کم اس معیار پر میرے خیال میں ان کی یہ نظم بلند مقام کی مستحق ہے

اخیر میں وہ لکھتے ہیں،

مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالے ماہر القادری کے اس سلام کے بعد میلادی مجالس

سلاموں کی تاثیر وافادیت میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہوگا، مسلمانوں کو چاہئے کہ آیندہ اسی سلام کو میلادی مجلسوں میں پڑھنے اور پڑھانے کا دستور جاری کریں اور وہ دن کچھ دور نہیں کہ ماہر کا یہ سلام پشاور سے برما تک اور کاٹھ منڈو سے راس کماری تک کے علاقوں کو فتح کرے گا،

مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے اہل دل دیوبندی عالم کی یہ ستائش جناب ماہر القادری کی نعت کے لیے حرف آخر ہے، اور یہ سلام واقعی بہت مقبول ہوا، اور خدا جانے کتنی مجلسوں میں پڑھا گیا، خود ماہر القادری صاحب کی زبان سے کتنی بار سنا گیا، ان کے پڑھنے کا انداز بھی ایسا تھا کہ وہ پڑھتے تو سننے والے کے دل سے آنسوؤں کا سیلاب بہ کر آنکھوں کی راہ سے نکلنا ناگزیر تھا، جناب ماہر القادری نے اپنے اس سلام کو اس نعتیہ کلام کے مجموعہ کے ساتھ بھی شایع کیا، جس کا نام انھوں نے ذکر جمیل رکھا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں،

"خدائے پاک کے ناموں کی قسم رسول پاک کے مقدس نام کی لذت کبھی کم نہیں ہوئی، جتنی بار بھی محمد کہئے اک نیا کیف اور ایک نئی لذت محسوس ہوتی ہو محمد رسول اللہ سن کر یا کہہ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کجکلاہیاں بھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچ سکتیں اللہ کے نام کے بعد اسی نام پر خاتمہ چاہتا ہوں،

اسی میں وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ

میں نے اپنے آقا ومولا کی مدح لکھ کر کفارۂ معاصی کی کوشش کی ہے، اللہ کی رحمت اور نبی کی شفاعت سے کیا بعید ہے کہ یہی کار نیک وسیلہ بخشش اور ذریعہ نجات بن جائے، قیامت کے دن ایک ہاتھ میں فرد عمل اور دوسرے ہاتھ میں ذکر جمیل ہوگی، ذکر جمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے مختلف طریقوں سے

جو محبت وعقیدت کا اظہار کیا گیا ہے عجب کیا اس نعت گو کے لیے یہی وسیلۂ بخشش ہوجائے انہیں ایک نعت صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے ہے، جو اسی انداز میں کہی گئی جس میں اعظم گڈھ کے جناب اقبال سہیل کی نعت موج کوثر بہت مقبول ہوئی، وہ مجھ سے برابر کہتے رہے کہ اقبال سہیل کے بہت قائل اور معترف ہیں، اس مجموعہ کے اور دوسرے کچھ عنوانات یہ ہیں انسان گرے پیدا شد، اسیران بدر، حریت کا مبلغ اعظم، جشن ولادت، دربار اقدس میں پیغمبر انسانیت، جانوروں سے حسن سلوک، شاہ حسین کے دربار میں، حضرت جعفرؓ کی تقریر، ساقی نامہ، اور معراج کی رات وغیرہ،

ان کی آخری تمنا یہ تھی کہ ذکر جمیل کا کچھ حصہ دربار اقدس میں حاضر ہوکر اپنی زبان سے عرض کریں، اور اس کے بعد اسی جان حیات کے سامنے دم نکل جائے، جس کے قدموں پر جان نچھاور کرنے کے لیے دی گئی تھی، ان کی یہ تمنا بڑی حد تک پوری ہوئی، وہ ۱۹۵۴ء میں حج کے لیے گئے، ظاہر ہے کہ روضۂ نبوی کے سامنے پہونچ کر ان کی کیا قلبی کیفیات ہوئی ہونگی ذکر جمیل کے کن کن اشعار کو نہ دہرایا ہوگا، اور اس وقت تو اپنی جان وہاں نچھاور نہیں کی لیکن ۱۹۷۸ء میں اپنے رسول کے مولد ومنشاء میں سپرد خاک ہوکر اپنی آخری تمنا پوری کی،

وہ ۱۹۵۴ء میں حج کے لئے گئے تو واپسی پر کاروان حجاز کے نام سے اپنا سفر نامہ شائع کیا، جس میں ان کی پوری تصویر نظروں کے سامنے گھومتی نظر آتی ہے، وہ اس میں لکھتے نہیں دکھائی دیتے، بلکہ جن لوگوں کو ان کی صحبت میں ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا ہے، ان کو اس کے پڑھنے میں محسوس ہوگا کہ وہ بول رہے ہیں، اور لوگ ان کو سن رہے ہیں، انھوں نے پورا سفر نامہ بہت ہی والہانہ انداز میں لکھا ہے، جب وہ حرم شریف پہونچے تو فجر کی نماز کے لیے اذان ہوئی، ان کو اس میں بڑی دلکشی محسوس ہوئی، صبح کا سہانا وقت تھا،

بوقبیس کی چوٹیوں پر سپیدۂ سحر کے آثار کا آغاز ہو رہا تھا، حرم کے در و دیوار میں ان کو تجلیاں نظر آئیں، بیت اللہ کی جلالت شان، اور در و دیوار و ان پر سیاہ غلاف کے سکوت کا باوقار منظر ان کے لئے جنت نگاہ بن گیا، اسی وقت بہت سے اشعار قلمبند کئے، جن میں سے کچھ یہ ہیں،

حرم میں اذان سحر اللہ اللہ — کہ ہیں وجد میں بام و در اللہ اللہ
یہ میزاب رحمت وہ رکن یمانی — مقامات اہل خبر اللہ اللہ
دھڑکتے ہوئے دل کا لے کر سہارا — مناجات با چشم تر اللہ اللہ
تجلی میں دھوئے ہوئے سنگریزے — یہاں کے نجوم و قمر اللہ اللہ
مقام ابراہیم پر یہ نمازیں — یہ ہر سجدہ معراج سر اللہ اللہ
جلال الٰہی کی تابندگی میں — جھلکتے ہوئے بام و در اللہ اللہ
وہ کعبہ جسے دیکھ لینا عبادت — مسلسل ہے پیش نظر اللہ اللہ

حج کے بعد جب وہ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت بھی انھوں نے فی البدیہہ کچھ اشعار کہے جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

پاک دل، پاک نفس، پاک نظر کیا کہنا — بعد مکہ کے مدینہ کا سفر کیا کہنا
جیسے جنت کے دریچوں سے جھلکتی ہو بہار — پہلی منزل ہی کے انوار سحر کیا کہنا
تپش شوق بھی ہے گرمی موسم بھی ہے، — اور پھر اس پہ مرا سوز جگر کیا کہنا
خشک آنکھوں کو مبارک ہو یہ طغیانی شوق — ہیں رواں اشک بہ انداز دگر کیا کہنا

مدینہ منورہ پہونچ کر جب مسجد نبوی میں پہونچے تو لکھتے ہیں،

"یہ سرو قامت ستون، یہ مصفا جھاڑ فانوس، یہ نظر افروز نقش و نگار ایک ایک

چیز آنکھوں میں کھبی جا رہی ہے، اس ظاہری چمک دمک سے بڑھ کر جمال و رحمت کی فراوانی! جیسے مسجد نبوی کے در و دیوار سے رحمت کی خنک شعاعیں نکل رہی ہیں!

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

کی معنویت آج سمجھ میں آئی، تجلیوں کا وہ ہجوم کہ آنکھیں جلوے سمیٹتے سمیٹتے تھکی جا رہی ہیں، یہاں کے انوار کا کیا پوچھنا، یہ آفتاب جہاں تاب بے چارہ اس جلوہ گاہ کے ذروں کا ادنیٰ غلام ہے دائیں بائیں اوپر نیچے، ادھر ادھر روشنی ہی روشنی اور نور ہی نور، مگر لطف یہ کہ آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں، یہ آنکھوں کا نہیں خود یہاں کی تجلیوں کا کمال ہے،

انھوں نے مسجد نبوی کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ، باب جبریل، جنت فاطمہؓ صفہ، مسجد قبا، اور میدان احد کا بھی دلنشیں انداز میں ذکر کیا، سیدنا حمزہ کے مزار، جنت البقیع، سیدہ فاطمہؓ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق، حضرت عثمان بن عفانؓ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور مشہور محدث امام مالکؒ کے مزارات کی زیارت میں ان پر جو کیفیات طاری ہوئیں، ان کو بہت ہی موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک ایک مزار پر دل کھنچا، اور موت بھی یاد آئی، وہ قبر پرستی کے تو قائل نہیں تھے، مگر رقمطراز ہیں کہ جنت المعلا کو دیکھ کر جی دکھ ہوا، اس میں صحابہ کرام، تابعین عظام، اور اکابر و اولیا آسودہ ہیں، حضرت سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر کو چھوڑ کر ہر طرف جھاڑ جھنکار، اونٹوں اور دنبوں کی مینگنیاں اور گندگی نظر آتی ہے، یہ تو ان نفوس قدسیہ کی قبریں ہیں جو ہم سب کے مخدوم اور محسن ہیں، عام مسلمانوں کی قبروں کے ساتھ بھی یہ سلوک جائز نہیں میرے دو شعر ان ہی

تاثرات کی یادگار ہیں،

فغاں کروں کہ شکایت منھوں کہ اشکبار ہوں
کھنڈر ہوا ہوں میں ٹوٹے ہوئے مزاروں پر

تجلیاں تو چھپانے سے چھپ نہیں سکتیں
ہزار خاک اڑا گے کوئی ستاروں پر

جب وہ تصوف اور قبر پرستی کے خلاف اپنے دوستوں سے بحث کرتے، تو ان کے ان اشعار کا حوالہ دیا جاتا، وہ تھوڑی دیر کے لیے جزبز تو ضرور ہو جاتے مگر پھر اپنی طلاقت لسانی سے اپنے معترضین کو خاموش کر دیتے، مگر اس سفرنامہ میں انھوں نے یہ لکھ کر اپنی فراخدلی کا بھی ثبوت دیا ہے کہ مدینہ منورہ ہی میں ترجمان السنۃ کے مصنف مولانا بدر عالم میرٹھی سے ملاقات ہوئی، ان کے بعض حکمت آمیز نکتوں نے میرے دل کی کتنی گرہیں کھول دیں، ان کے بعض ارشادات پر میں گفتگو کر سکتا تھا، مگر میں نے بات کو طول دینا پسند نہیں کیا، رشتۂ تصوف میں کچھ ایسے پیچ بھی پڑے ہوئے ہیں، جن کو سلجھانا دشوار ہے، انھوں نے بار بار کہا کہ اہل تصوف، فقہا اور مفسرین پر کوئی نیک نیتی کے ساتھ ذرا سی بھی تنقید کرتا ہے تو اس دور انکار و الحاد میں متشککین اور منکرین کو شہ مل جاتی ہے، اور انکار و تشکیک کے لئے مسالہ ہاتھ آجاتا ہے، یہ لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن اپنی نجی صحبت میں تصوف کے متعلق ان کے وہی خیالات رہے جن کا اظہار اپنی نجی صحبتوں میں کرتے رہے،

ان کا سفرنامہ کاروان حجاز ان کے تمام ذہنی خیالات کا کشکول ہے، اس میں تبلیغی جماعت، تحریک پاکستان، قبر پرستی، تصوف، شاہ ابن سعود، شریف حسین، ترکوں کی حکومت اور دوسرے مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کھل کر کیا ہے، ان کی طبیعت میں بڑی صاف گوئی تھی، ظاہر اور باطن یکساں تھا، اس لئے ان کے دل میں جو بات ہوتی وہ ان کی زبان اور تحریر میں برملا آجاتی، مگر اس کا لحاظ ضرور رکھتے کہ خیر کے بجائے شر نہ ابھرنے پائے،

اس لحاظ سے وہ محتاط تھے،

۱۹۵۵ء میں ان کے کلام کا مجموعہ فردوس کے نام سے مکتبۂ چراغ راہ بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے شائع ہوا، اس کے کچھ عنوانات یہ ہیں، لا الٰہ الا اللہ، صبح سعادت، طیبہ کی زیارت ہوتی ہے، منقبت، سلام، سوئے مدینہ، نغمۂ حرم، حجاز سے رخصت ہوتے ہوئے، نوائے جبریل، خلافت الٰہی، مغربی تہذیب، مسلمان عورت سے، سجدہ و تکبیر، اشتراکیت وغیرہ ان کے کچھ برق پارے اور کچھ غزلیں بھی اس میں ہیں، ان کی شاعری پر تبصرہ مختصر طریقہ پر یہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے سامنے ایک مقصد تھا، ان کا مقصد ان کی شاعری پر چھایا ہوا ہے، انکے نقاد کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مقصد نے ان کے فن شاعری کو دبا رکھا ہے۔ وہ اپنے مقصد کی ترویج اپنے زور کلام کے ذریعہ جس طرح کرتے رہے، اس سے ان کی مخالفت بھی ہوتی رہی، لیکن وہ دب کر اپنی شاعری میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے، انکے خیالات سے چاہے کوئی کتنا ہی اختلاف کرے لیکن وہ آخر وقت تک ایک جواں ہمت اور جوان حوصلہ شاعر رہے، بہ بانگ دہل کہا،

مین کسی خوف سے خاموش نہیں رہ سکتا ظلمت شام کو میں صبح نہیں کہہ سکتا

وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے معتقد تھے، اور ان کے جو خیالات تھے، وہی اپنی شاعری میں پیش کرتے رہے، وہ اسلام پسند شاعر کہلانے میں، فخر محسوس کرتے رہے، رہی ان کی غزل گوئی تو بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں،

اب وقت ہے کہ شعر و ادب کی زبان سے مفہوم لا الٰہ بتاتے ہوئے چلو

اور اپنے اس جذبہ پر ان کو پورا اعتماد رہا، اس لئے کہتے ہیں،

مرا ہر شعر ماہر شارح آیات قدرت ہے وہاں جذب و یقین کی ترجمانی ہو جہاں میں ہوں

تو وہ اپنی قادر الکلامی سے اس میں غزل کی وہ ساری خوبیاں پیدا کر سکتے تھے، جو غزل کے اجزائے ترکیبی کے لیے ضروری ہیں، ان میں وہ نغمہ، ترنم، موسیقیت، ایمائیت، جذباتیت اور کیفیت پیدا کر کے نرالی شان پیدا کرتے رہے، ان کی اس غزل کو پڑھ کر کون ہے جس میں کیف و سرور نہیں پیدا ہو سکتا ہے،

جب غم کی لطافت بڑھتی ہے، جب درد گوارا ہوتا ہے
اشکوں میں تبسم ڈھلتا ہے، فریاد میں نغمہ ہوتا ہے
فرقت کی بھیانک راتوں میں کیا طرفہ تماشا ہوتا ہے
شمعیں بھی فروزاں رہتی ہیں اور گھر میں اندھیرا ہوتا ہے
بیمار کی حالت کیا کہئے درد آخری حد میں آپہونچا
پرسش کا زمانہ بیت گیا تسکین سے اب کیا ہوتا ہے
سورج کی شعاعیں افسردہ، آنکھیں پرنم، دل پژمردہ
اک جب بھی سویرا ہوتا تھا اک اب بھی سویرا ہوتا ہے
وہ یاد سلامت ہے جب تک دنیا کے غموں کی کیا پروا
کانٹوں میں بھی رہ کر اے ہمدم! پھولوں میں بسیرا ہوتا ہے
سمجھو تو خموشی سب کچھ ہے، دیکھو تو خموشی کچھ بھی نہیں
آواز بھی ہے، الفاظ بھی ہیں مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے
ماہر مرے شعروں کے خاکے اس طرح مرتب ہوتے ہیں
کچھ دل بھی تقاضا کرتا ہے، کچھ ان کا اشارہ ہوتا ہے

انھوں نے کچھ افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں جن کے نام یہ ہیں، انگڑائی، طلسم حیات،

حسن و شباب، نگینے، جب میں جوان تھی، کردار اور کانجی ہاؤس وغیرہ، اسلام کے موضوع پر
ان کے چھوٹے چھوٹے رسالے آخری رسول، خدا اور کائنات، درِ یتیم، اور نقشِ توحید بھی
شائع ہوئے، ان کے روزنامچے اور خطوط بھی طبع کئے گئے ہیں،

ان کے اشعار کے اور دوسرے مجموعوں کے نام نغمات ماہر، جذباتِ ماہر اور محسوساتِ
ماہر ہیں، اور بھی کچھ چھپنے کو باقی رہ گئے ہوں گے، ان تمام مجموعوں کو سامنے رکھ کر آیندہ ان کے
شاعرانہ کمالات پر مقالے لکھے جائیں گے، وہ فاران جس انداز میں نکالتے رہے وہ خود
ایک بڑا کارنامہ ہے، ہند و پاکستان دونوں جگہوں کے ارباب قلم کو ڈر لگا رہتا کہ کہیں فاران
کے مدیر کی نظران کی تحریروں پر پڑ گئی تو وہ زبان، طرزِ ادا، طرزِ فکر کی ساری خامیوں کے بخیے
ادھیڑ کر رکھ دیں گے، اس طرح وہ فاران کے ذریعہ سے علم و ادب کے بڑے محتسب بھی
بنے رہے، فاران میں نقشِ اول کے عنوان سے جو کچھ لکھتے وہ اس برصغیر میں شوق سے
پڑھا جاتا، ان کے مجموعے بھی اگر شائع ہوں گے تو آیندہ ان سے بڑی علمی بصیرت حاصل
ہوگی، انھوں نے فاران میں جو مضامین لکھے ہیں، ان کو بھی کتابی صورت میں شایع
کرنے کی ضرورت ہے، ان سے علم و ادب میں گراں قدر اضافہ ہوگا، فاران کا جو سیرت
نمبران کی ادارت میں نکلا تھا وہ بھی کتاب کی صورت میں شایع ہو جائے، تو یہ بھی ایک
بلند علمی کام ہوگا، انھوں نے اس کے نقشِ اول میں لکھا تھا:

"دنیا اگر فوز و فلاح اور سکون و اطمینان چاہتی ہے، تو اسے چاہئے کہ وہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات کے مطابق اپنے کو بدلے، جاہے
اس تبدیلی میں معاشرے کی ایک ایک اینٹ کو کیوں نہ اکھیڑ باہر پڑے مگر یہ نہیں
ہو سکتا کہ تمدن و تہذیب اور معاشرے کی غلط کاریوں سے ......

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں ایک شوشہ کی بھی تبدیلی گوارا کر لی جائے، زندگی
اور ترقی نام ہی اسوۂ حسنہ کی اتباع کا ہے، جہاں یہ اتباع نہیں وہاں رجعت ہے
زوال ہے، اور موت ہے،"

ان کا یہ پیغام دنیا کے تمام گوشوں تک تو نہ پہونچ سکے گا، مگر پاکستان تو ان کے اس پیام کو
کم از کم سن کر اس پر غور کر سکتا ہے،

ان کو سیر و سیاحت کا بھی بڑا شوق تھا، ۱۹۶۹ء میں جنوبی اور مشرقی افریقہ کی دعوت
پر وہاں کے مشاعرے میں شرکت کی تو روم، اسپین اور انگلستان کے مختلف شہروں کی سیاحت
کرتے ہوئے کراچی واپس آئے، لندن تو مشاعرہ میں غالباً کئی بار گئے،

وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں، خدا جانے ان کے بھائی مسرور حسین پر کیا گزری ہوگی،
معلوم نہیں پاکستان کے علم و ادب کے حلقوں میں ان کے بغیر جو بے رونقی آگئی ہے، وہ پھر
کب واپس آئے گی، ان کے احباب ان کی بذلہ سنجیوں سے محروم ہو کر جو سوگوار ہوئے ہوں گے
ان کی سوگواری کب ختم ہوگی، مولانا ظفر احمد انصاری ان سے مل کر اپنے بڑھاپے میں جوانوں
کی جو رعنائی محسوس کرتے تھے، وہ اب ان کو اپنی بقیہ زندگی میں شاید ہی محسوس ہو، انکی وفات پر مولانا
ابوالاعلیٰ مودودی کی نمناک آنکھیں معلوم نہیں کتنے دنوں کے بعد خشک ہوئی ہوں گی، وہ اپنی نیکیوں،
عشقِ رسول کی تابناکیوں، اسلام کے نام پر دل کی اپنی دھڑکنوں کی بدولت کوثر و تسنیم
کے کنارے ضرور کھڑے ہونگے، مگر اپنے تمام ملنے والوں کو اپنا یہ پیام چھوڑ گئے ہیں،

ماہر میں محبت کے صحیفوں میں ملوں گا،
ڈھونڈیں جو کبھی مجھکو میرے ڈھونڈنے والے

ادبیات

غزل

از

ڈاکٹر سلام سندیلوی شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی

اپنے داغوں کا ترے سامنے خرمن رکھ دوں
میری خواہش ہے ترے ہاتھ پہ گلشن رکھ دوں

اشک برساؤں ترے عارضِ گلگوں پر میں
جی میں آتا ہے کہ انگارے پہ ساون رکھ دوں

اپنی راحت کے لیے کیوں میں لٹے دوں رحمت
شاخِ بوسیدہ پہ کیوں بارِ نشیمن رکھ دوں

کچھ زباں سے نہیں کہتی ہے غمِ دل شبنم
اس کے منھ میں ذرا برگِ گلِ سوسن رکھ دوں

آپ کرتے ہیں زمیں پر مہ و انجم کی تلاش
آپ کے سامنے اشکوں بھرا دامن رکھ دوں

شرم کی وجہ سے نظارہ نہیں کرتی ہے
چشمِ نرگس پہ ذرا پلکوں کی چلمن رکھ دوں

کتنے تارے ہیں مگر پھر بھی ہے ظلمت ہر سو
چرخ پر داغِ جگر کا مہ روشن رکھ دوں

کچھ تو ہمدردی کے جذبات سے وہ واقف ہو
سنگ میں آئینے کے قلب کی دھڑکن رکھ دوں

غیر کے دل کا بھی ارمان نکل جائے سلام
برق کے سامنے خاشاک نشیمن رکھ دوں

......

مطبوعات جدیدہ

قصاص عثمان جلد اول، مرتبہ جناب محمد کاظم عثمانی ہاردنی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۴۴، قیمت ۶؎ ر پتہ از مصنف، ۱۹۷۔ A دائرہ شاہ اجمل الہ آباد ۳ یو، پی

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت اسلامی تاریخ کا نہایت افسوسناک واقعہ ہے، باغیوں کی ریشہ دوانی سے حالات اتنے پیچیدہ ہوگئے کہ قاتلوں اور ان کے ہم نواؤں کو سزا بھی نہ دی جا سکی، سبائیوں کی فتنہ پردازی نے امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور افتراق و انتشار کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کا انسداد آج تک نہ ہو سکا، مگر مصنف کا یہ اصل مدعا ان کی ژولیدہ بیانی کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ گیا ہے، صحابہ کرام کی عزت و تکریم بھی زیر بحث آگئی ہے، اظہار خیال میں احتیاط کے بجائے انتہا پسندی اور بے باکی سے کام لیا ہے، حضرت علیؓ کی سیرت کو داغ دار کر دیا ہے، انھیں ضدی اور حصول خلافت کا شائق بتایا ہے (ص ۵۰ و ص ۶۲) مصنف کو اپنے بارہ میں خیال ہے کہ انھوں نے جو "صدائے حق" بلند کی ہے، وہ گذشتہ چودہ سو برس میں کسی نے نہیں کی تھی (ص ۲۲) غالباً اسی احساس اور خوش فہمی نے ان کو امت کے اکابر اور مفسرین کرام کے بارہ میں اس قدر جری بنا دیا ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اصحاب عشرہ مبشرہ پر طعنہ زنی اور اتہام انگیزی کی (ص ۶۴) ان کو امت کے اندر کوئی شخصیت محفوظ و مصئون نظر نہیں آتی، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اسلام کیلئے انھوں نے کچھ نہیں کیا (ص ۹۵) جب صحابہ و تابعین کے بارہ میں خیالات یہ ہیں تو مفسرین

غریب کس شمار میں ہیں، ان پر تحریف اور حذف واضافہ کا الزام عائد کیا ہے (ص ۱۸) — حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنے پیدا ہوئے، ان کے دور رس اثرات ہماری تاریخ پر پڑے ہیں، مگر ایسا نہیں کہ راہ حق اور صراط مستقیم نگاہوں سے اوجھل ہوگئی، سبائیوں کی سازشیں اور فتنہ انگیزیاں مسلم ہیں، لیکن حضرت علیؓ اور کبار صحابہ کی ذات محل نظر نہیں ہوسکتی، مصنف اپنی کتاب کو تحقیق کا شاہکار سمجھتے ہیں (ص ۱۹-۶۱) ان کا یہ دعویٰ واقعات کی روشنی میں صحیح ثابت نہیں ہوتا ہے، حضرت عثمانؓ کے بعد فتوحات کا انکار تاریخ کا انکار ہے، امویوں، عثمانی ترکوں اور تیموریوں کی فتوحات ناقابل انکار ہیں، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں لاکھوں میل کا رقبہ ان کے عہد میں اسلامی مملکت میں شامل ہوا۔ مصنف اپنی انتہا پسندی میں حضرت علیؓ کو خلفاء راشدین میں شمار نہیں کرتے ہیں (ص ۹۴) مگر یہ پوری امت کے اجماع کے خلاف ہے، صحابہ کرام کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ "وہ حافظ قرآن تھے، مگر محافظ قرآن نہ تھے" بہت ہی قابل اعتراض ہے، صحابہ اگر قرآن مجید کی حفاظت نہ کرتے تو آج ہمارے پاس قرآن مجید محفوظ شکل میں کس طرح پہونچتا؟ حضرت عثمانؓ کا قصاص نہ لئے جاسکنے کے اسباب تھے، جو تاریخ کے اوراق میں کھلے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر مصنف ان واضح حقائق کو نظر انداز کر گئے ہیں، خیالات کی طرح تحریر میں بھی ناہمواری ہے، اس کتاب کے مباحث و مضامین میں کوئی ربط و تسلسل نہیں، الفاظ اور فقرے تک بے محل استعمال کئے گئے ہیں، مثلاً میرے جذبات کے اظہار کا یہ ایک پر کیف منظر ہے، میں اسے رو رو کر لکھ رہا ہوں (ص ۳۸) جب پر کیف منظر ہے تو ہنس ہنس کر لکھنا چاہئے تھا نہ کہ رو رو کر، حکم کی جمع ہر جگہ احکامات لکھی ہے، تفسیر اور آواز کو مذکر اور حالات کو مونث لکھا ہے، بزرگوں نے مشاجرات صحابہ کے باب میں سکوت اور کف لسان کی تاکید کی ہے، مصنف ایک مشہور مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، لیکن انھوں نے صحابہ کرام اور ان کے دور کی جو تصویر

پیش کی ہے، اس کے بعد خود ہی غور کریں کہ کجا ماند مسلمانی؟

قصیدۃ الاعشیٰ الکبیر فی مدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم — تصحیح و تحقیق

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب، صدر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، تقطیع کلاں، کاغذ متوسط ٹائپ صفحات ۲۵، قیمت درج نہیں، ناشر مکتبہ جامعہ اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اعشیٰ عرب جاہلیت کے ممتاز شعراء اور اصحاب معلقات میں تھا، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ملا، مگر اسلام کی سعادت نصیب نہ ہوئی، وہ قبول اسلام کے ارادہ سے دربار نبوت میں حاضر ہونے جا رہا تھا، لیکن رؤساے قریش نے روک دیا، اس موقع کے لئے اس نے جو قصیدہ کہا تھا اس کے اشعار اعشیٰ کے کلام کے متعدد مجموعوں کے علاوہ تاریخ و ادب عربی کی کتابوں میں موجود ہیں، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے آکسفورڈ کے قیام کے زمانہ میں لیڈن کے کتب خانہ میں امرء القیس اور اعشیٰ کے کلام کے ایک قلمی مجموعہ میں یہ قصیدہ بھی دیکھا، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ابو عمرو شیبانی کی روایت سے ہے، جب کہ دوسرے مجموعوں میں وہ ابو العباس ثعلب کی روایت سے نقل ہوا ہے، علاوہ ازیں اس میں قصیدہ کی شرح بھی تھی، گو شارح کے نام کی تشریح نہیں، تاہم ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ ابو الغنائم مسلم بن محمود شیزری کی شرح ہے اب انھوں نے علمی و ادبی خدمت کے خیال سے اس قصیدہ اور اس کی شرح کو مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، حاشیہ میں حوالوں کی تخریج، روایتوں کے فرق و اختلاف کی تصریح، مشکل الفاظ کی وضاحت اور اسماء و اعلام کے مختصر ترجمے دئے گئے ہیں، شروع میں ان کے قلم سے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی ہے، اس میں اعشیٰ کے شاعرانہ کمالات، قصیدہ کا پس منظر، اس کی اہمیت اور زیر نظر مخطوطہ کی خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، عام خیال ہے کہ اعشیٰ صلح حدیبیہ کے بعد خدمت نبوی میں حاضر ہونے کے قصد سے نکلا تھا اور اس کو رئیس مکہ ابو سفیانؓ نے سو اونٹ دے کر

واپس کر دیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے بھی مقدمہ میں اسی روایت کو نقل کیا ہے، لیکن ان کے شائع کردہ نسخہ کی شرح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے، اور اس زمانہ کے رؤسا عتبہ بن ربیعہ اور ابوجہل نے اعشیٰ کو روکا تھا، ڈاکٹر صاحب نے دونوں روایتوں کے تضاد پر کوئی گفتگو نہیں کی ہے، انھوں نے مقدمہ میں بعض علمائے ادب کی اس رائے کا ذکر تو کیا ہے کہ "اعشیٰ کی جانب اس قصیدہ کی نسبت صحیح نہیں ہے" لیکن خود اس کی صحت و عدم صحت پر کوئی بحث نہیں کی، جس سے پتہ چلتا کہ ان کے نزدیک یہ قصیدہ واقعۃً اعشیٰ کا ہے یا نہیں۔

انتخاب کلام آصف سابع: متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰ علاوہ فہرست و دیباچہ، مجلد، پتہ: دفتر معتمدی، ایچ، ای، ایچ دی نظامس ٹرسٹس پریڈ ویلا، فتح میدان کلب، حیدرآباد، آندھرا پردیش۔

اردو زبان کی ابتدا ہی سے حیدرآباد دکن اس کا مرکز رہا ہے، بہمنی دور میں اردو شاعری کا یہاں آغاز ہوا، اور اس نے عہد قطب شاہی و عادل شاہی میں ترقی کی منزلیں طے کیں، ان حکمرانوں نے شعر و ادب اور علوم و فنون کی سرپرستی کی جو روایت قائم کی تھی، وہ آصف جاہی دور میں بھی نہایت شان سے قائم و برقرار رہی، اس خانوادہ کے امرائے ذی شان علم پروری و ادب نوازی کے ساتھ خود بھی شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے، نظام الملک آصف جاہ سابع کا دور اس حیثیت سے زیادہ ممتاز ہے، اردو یونیورسٹی انھیں کے دور میں قائم ہوئی، انجمن ترقی اردو کی بنیادیں مستحکم ہوئیں، مولانا شبلی مرحوم اور دارالمصنفین بھی ان کی فیاضیوں سے متمتع رہے ہیں، سیرۃ النبی کی پہلی جلد شائع ہوئی تو حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں نذر کیا جس کو

ملاحظہ فرماکر بہت مسرور ہوئے اور دو ہزار ماہوار کا وظیفہ جاری کیا، وہ خود بھی صاحب علم و کمال تھے اور شعر و سخن کا ستھرا اور عمدہ مذاق رکھتے تھے، شاعری مدت العمر ان کا مشغلہ رہا، اس لئے کلام کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑ گئے ہیں جس کی اشاعت کے لئے خود اپنی زندگی ہی میں ایک ٹرسٹ اور جمع و ترتیب کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی تھی، کمیٹی کلام کو اکٹھا کر کے مرتب کر چکی ہے، مگر ابھی مکمل کلام کی اشاعت میں تاخیر ہوگی، اس لئے ٹرسٹ نے سردست دو منتخب مجموعے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ پہلا مجموعہ ہے جو اردو و فارسی قطعات، قصائد، نعت و منقبت اور غزلوں کے علاوہ بعض ٹھمریوں پر مشتمل ہے، ان کا ادبی ذوق پختہ اور مطالعہ گہرا تھا اور پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے بقول "وہ اردو شعر کی عظیم روایت کے محافظ اور ضامن تھے" کلام میں سادگی، زبان و بیان میں صفائی، سلاست، روزمرہ اور محاوروں میں بے ساختگی، تشبیہ و استعارات میں دلکشی اور طرز ادا میں لطافت ہے، ان کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص عقیدت اور والہانہ تعلق تھا، اس لئے نعتوں میں جوش، مستی اور سرشاری کی عجیب کیفیت ہے۔ وہ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ اور شہدائے کربلا سے بھی غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، لیکن ان سے متعلق شاعری میں تفضیلی رنگ آگیا ہے، شروع میں پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے قلم سے ایک دیباچہ ہے، اس میں کلام پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے، یہ مجموعۂ کلام ارباب ذوق کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے۔

حج مسنون: مرتبہ۔ مولانا مختار احمد ندوی، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۴۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ: الدار السلفیہ، حامد بلڈنگ، مومن پورہ، مولانا آزاد روڈ، بمبئی۔

اردو میں حج پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس کے لایق مصنف کو اللہ نے حج و زیارت کی کئی بار سعادت عطا کی ہے، اس لئے ان کو حج کے احکام و مسائل سے عملاً واقفیت رہی اور انھوں نے حج کی حقیقت، اہمیت اور فضیلت نیز اس سے متعلق اکثر ضروری اور اہم باتیں اس کتاب میں اختصار سے تحریر کی ہیں، اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ تمام مسائل و مناسک کتاب و سنت کے حوالے سے تحریر کئے گئے ہیں، اور مزید سہولت کے لیے نمبروار ان کا خلاصہ بھی دے دیا گیا ہے، مصنف نے حج کے سلسلہ کی بدعتوں اور غلط رسموں کی تردید پر بھی پورا دھیان دیا ہے، البتہ وہ اہل حدیث ہیں، اور اسی فقہ کے مطابق احکام و مسائل تحریر کئے ہیں، اس لئے بعض مسائل سے دوسرے فقہی حلقوں کو اتفاق نہ ہوگا، لیکن کتاب مفید ہے ہر شخص کے مطالعہ میں آنے کے لایق ہے، زبان عام فہم اور پیرایہ بیان دلنشین ہے،

مرتبہ، مولانا ابوالعرفان ندوی تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت ... قیمت دو روپیہ پچیس پیسے، پتہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

مولانا ابوالعرفان ندوی نے بہت عرصہ پہلے لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالہ صبح صادق کے لئے ائمہ اربعہ کے حالات لکھے تھے، اب مکتبہ جامعہ نے ان کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اردو میں غالباً ابھی تک ان ائمہ کے حالات کسی کتاب میں یکجا نہ تھے، یہ مضامین اوسط درجہ کے لوگوں کے لئے لکھے گئے تھے، اس لئے ان میں ائمہ اربعہ کے فقہی کارناموں اور ان امور و مسائل سے تعرض نہیں کیا گیا ہے، جو عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھے، بلکہ مختصر حالات، اور بعض موثر اور سبق آموز واقعات زندگی کے ذکر ہی پر اکتفا کیا گیا ہے، کتاب جس مقصد سے لکھی گئی ہے، اس لحاظ سے کامیاب اور مختصر ہونے کے باوجود مفید ہے،

((ض))

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

۱- مہاجرین جلد دوم قیمت: ۱۲-۹

۲- سیر الصحابہ جلد ۶ " ۹-۴

امام حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں واقعۂ محزنۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳- سیر الصحابہ جلد ۷،

۴- تابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح، قیمت: ۱۲-۵۰

۵- تاریخ اسلام اول (عہد رسالت و خلافت راشدہ) قیمت: ۱۲-۵۰

۶- تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۱۱-۰

۷- تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول) قیمت: ۱۴-۰

۸- تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم) قیمت ۱- ۱۵-۰۰

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت ۱۵-۶۵

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں، قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دین رحمت قیمت ۱- ۱۰-۰۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۴-۷۵

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی علمی تعلیمی ادبی ملی سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا مثنیٰ، دلکش، دلچسپ قابل مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۲۷-۵۰